www.alrisala.org

الرسالہ

Al-Risala

April 2011 • No. 413

وقت کے استعمال کا بجٹ بنائیے، جس طرح
آپ اپنی آمدنی اور خرچ کا بجٹ بناتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اپریل 2011

خصوصی شمارہ

انسانی تاریخ کا مطالعہ

خدا کے تخلیقی پلان کی روشنی میں

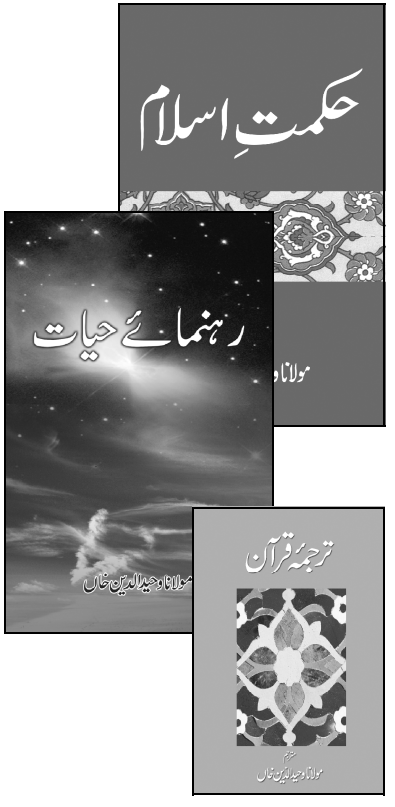

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 46521511, 41827083
Fax: 45651771
www.goodwordbooks.com
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10
One year Rs. 100
Two years Rs. 200
Three years Rs. 300

Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

انسانی تاریخ کا مطالعہ

خدا کے تخلیقی پلان کی روشنی میں

انسان پوری کائنات میں ایک انوکھا استثنا (exception) ہے۔ قرآن میں انسان کی تخلیق کے بارے میں یہ الفاظ آئے ہیں: خلقتُ بيديَّ (38:75) یعنی انسان کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا۔ حدیث میں انسان کے بارے میں آیا ہے کہ: خلق اللّٰه آدم على صورته (صحيح البخاري، رقم الحديث: 5873) یعنی اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ قرآن اور حدیث کے اِن حوالوں سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ انسان کو اللہ نے ایک استثنائی مخلوق کے طور پر پیدا کیا ہے، اور استثنائی مخلوق کے طور پر اس کو پیدا کرنا اپنے آپ میں اِس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کے خالق کو اُس سے ایک استثنائی کردار (role) مطلوب ہے۔

کائنات کی تاریخ کو اگر بگ بینگ (Big Bang) کے واقعے سے شمار کیا جائے تو کائنات کی تاریخ تقریباً 15 بلین سال تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس مدت میں خالق نے بے شمار چیزیں پیدا کیں۔ آخر میں اُس نے انسان کو پیدا کیا۔ قرآن کے مطابق، خالق نے انسان کو احسنِ تقویم (95:4) کے ساتھ پیدا کیا اور اس کو ایک مکرَّم مخلوق (exalted creature) کا درجہ دیا (17:70)۔ قرآن سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے سوا جو بقیہ موجودات ہیں، وہ براہِ راست یا بالواسطہ طور پر انسان کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ اِس بات کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وسخّر لكم ما في السماوات وما في الأرض جميعاً منه، إن في ذلك لآياتٍ لقومٍ يتفكّرون (45:13)۔ قرآن کی یہ آیت ساتویں صدی عیسوی میں نازل ہوئی۔ عجیب بات ہے کہ اکیسویں صدی عیسوی میں سائنسی تحقیقات نے اِس حقیقت کی علمی تصدیق کی ہے۔ جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ پوری کائنات ایک کسٹم میڈ کائنات (custom-made universe) ہے۔ اِس تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے برٹش سائنس داں

الفریڈ رسل (Alfred Russel Wallace) نے لکھا ہے:

Such a vast and complex universe as that which we know exists around us, may have been absolutely required in order to produce a world that should be precisely adapted in every detail for the orderly development of life culminating in man. (*The Times of India*, New Delhi, September 26, 2010)

انسانیت کی تاریخ

مورخین نے تاریخ نگاری کے مختلف اسلوب اختیار کیے ہیں۔ مثلاً شاہی خاندان (dynasty) کو یونٹ (unit) بنا کر تاریخ لکھنا، جیسے مصر کے فرعون کی خاندانی بادشاہت، روس کے زار (Tzar) کی خاندانی بادشاہت، یا ایمپائر (empire) کو یونٹ بنا کر تاریخ لکھنا۔ مثلاً رومن ایمپائر، ساسانی ایمپائر (Sasanid empire)، یا تہذیب (civilization) کو یونٹ بنا کر تاریخ لکھنا، جیسے مسلم تہذیب، مغربی تہذیب، وغیرہ۔ لیکن تاریخ نگاری کا ایک اور اسلوب ہے جو زیادہ بامعنی اسلوب ہے، وہ یہ کہ خدا کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) کی بنیاد پر تاریخ لکھی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ مورخین نے انسانیت کے جن پہلوؤں کو اہم قرار دے کر ان کی نسبت سے تاریخ لکھی ہے، وہ سب تاریخ کے اضافی (relative) پہلو ہیں۔ تاریخ نگاری کا حقیقی پہلو (real) یہ ہے کہ خدا کے منصوبۂ تخلیق کو سمجھا جائے اور اس کے مطابق، انسانی تاریخ کو مرتب کیا جائے۔ اِس اعتبار سے بنیادی طور پر انسانی تاریخ کے چار دور ہیں:

1- انبیاء (prophets) کا دور، یہ دور حضرت آدم سے حضرت محمد تک پھیلا ہوا ہے۔

2- صحابہ کا دور، یعنی پیغمبر اسلام کے اصحاب (companions) کا دور۔

3- الاخوان کا دور، یعنی وہ لوگ جن کو حدیث میں اخوانِ رسول کہا گیا ہے۔

4- الصالحون کا دور، یہ دور قیامت کے بعد آخرت میں شروع ہوگا۔

خدا نے انسان کو ایک آزاد مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ بہت سے انسانوں نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کیا، اور کچھ لوگوں نے اپنی آزادی کا صحیح استعمال کیا۔ اِس طرح یہ تاریخ مختلف حالات سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ انسان کی آزادی کو باقی رکھتے ہوئے خدا اِس تاریخ کو مینیج (manage)

کر رہا ہے۔ آخر کار خدا قیامت برپا کرے گا۔ اس کے بعد وہ لوگ منتخب کر لیے جائیں گے جنھوں نے خدا کی نظر میں، اپنی آزادی کا صحیح استعمال کیا اور جنھوں نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کیا، وہ چھانٹ کر الگ کر دئے جائیں گے۔ اِس معاملے کو بائبل میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

The descendants of the wicked shall be cut off. (Psalm 37: 38)

جن اور انس کی تخلیق

قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیارہ زمین (planet earth) کو استثنائی طور پر اِس طرح بنایا ہے کہ یہاں زندگی کی بقا ممکن ہو سکے۔ خدا نے زمین پر وہ موافق نظام قائم کیا جس کو معاونِ حیات نظام (life support system) کہا جاتا ہے۔ اِس کے بعد زمین پر سب سے پہلے جنات (15: 27) کو آباد کیا۔ زمین ایک عرصے تک جنات کے چارج میں رہی۔ جن، آگ سے پیدا کئے گئے تھے۔ انھوں نے زمین پر فساد برپا کیا۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جنات کو معزول کر کے انسان کو پیدا کیا اور ان کو زمین پر بسایا۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے جب انسان کو بنایا، اُس وقت یہاں دو اور مخلوق جن اور ملائکہ (angels) موجود تھے۔ خدا نے دونوں کو یہ حکم دیا کہ وہ انسان کے آگے سجدہ کریں۔ یہ سجدہ اِس بات کی علامت تھا کہ جن اور ملائکہ انسان کے لیے رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ وہ انسان کو آزادی کے ساتھ عمل کا موقع دیں گے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: **إنّي جاعل في الأرض خليفة** (2: 30)۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان خلیفۃ اللہ ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خلیفۃ الجن ہے، یعنی جنات کو ہٹا کر ان کی جگہ زمین پر انسان کو ایک آزاد مخلوق کی حیثیت سے آباد کیا گیا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جب خدا نے انسان کو خلیفہ بنانے کا اعلان کیا تو فرشتوں نے اِس پر اپنے تردد کا اظہار کرتے ہوئے کہا: **أتجعل فيها مَن يفسد فيها ويسفك الدماء** (2: 30)۔ یہ بات فرشتوں نے غالباً جنات کے متعلق اپنے سابق تجربے کی بنیاد پر کہی۔ اُن کا مطلب یہ تھا کہ جب آزادی پا کر جنات نے زمین پر فساد برپا کیا، تو اِسی طرح انسان بھی آزادی پا کر زمین میں فساد برپا

کرے گا۔ اِس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إنّي أعلم ما لا تعلمون (2:30) یعنی میں وہ جانتا ہوں جس کو تم نہیں جانتے۔

غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جن اور انسان میں ایک بنیادی فرق ہے، وہ یہ کہ انسان کے خالق نے اس کی تخلیق میں استثنائی طور پر ایک طاقت ور جذبہ شامل کیا جس کو ندامت (feeling of guilt) کہا جاتا ہے، یعنی انسان اپنی آزادی کا بے جا استعمال کرکے ایک غلطی کرتا ہے، لیکن اس کے بعد اس کے اندر ندامت کا احساس جاگتا ہے اور وہ اپنی اصلاح کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ یہ جذبۂ ندامت جنات کے اندر موجود نہ تھا جن کو خالق نے آگ سے پیدا کیا تھا۔ اِسی جذبۂ ندامت کی بنا پر یہ امید تھی کہ انسان غلطی کرکے مستقل طور پر سرکش نہیں بن جائے گا، جیسا کہ ابلیس نے کیا، بلکہ وہ غلطی کرنے کے بعد نادم ہوگا اور دوبارہ اصلاح کے راستے پر چلنے لگے گا۔

ندامت (repentance) کا یہ جذبہ انسان کا ایک عظیم سرمایہ ہے۔ اِس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی صراطِ مستقیم سے بھٹکنے کے بعد دوبارہ مزید شدت کے ساتھ اُس پر قائم ہوجائے۔ اِس معاملے کی پہلی مثال خود انسانِ اول آدم کی زندگی میں ملتی ہے۔ قرآن کے مطابق، انھوں نے ایک غلطی کی اور پھر توبہ کرکے انھوں نے نبوت کا درجہ حاصل کیا (20: 121-122)۔ بعد کی تاریخ میں اِس قسم کی ایک معلوم مثال عمر بن عبدالعزیز اموی (وفات: 720ء) کی ہے۔ اُن سے ایک غلطی ہوئی اور پھر انھوں نے توبہ کی۔ اِس کے بعد اُن کو یہ درجہ حاصل ہوا کہ وہ اسلام کی تاریخ میں ایک انتہائی ممتاز فرد قرار پائے، حتی کہ اُن کو خلفاء راشدین کی فہرست میں شامل کرکے پانچواں خلیفہ کہا گیا۔

انسان کا مقصدِ حیات

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جنات اور انسان کو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں (56: 51)۔ صحابی مفسر عبداللہ بن عباس کی تفسیر کے مطابق، اس آیت میں عبادت سے مراد معرفت ہے (القرطبی 17/55)۔ معرفت سے مراد کوئی پراسرار معرفت نہیں ہے۔ یہ دراصل خدا کے تخلیقی منصوبہ کی معرفت ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی فکری صلاحیت (intellectual ability) کو

استعمال کرکے اپنے خالق اور اپنے رب کو دریافت کرے۔ پھر وہ اپنے آپ کو خالق کے منصوبہ میں شامل کرے، وہ اپنے آپ کو اِس کا اہل بنائے کہ خدا اس کو اپنے اعلیٰ انعامات سے نوازے، وہ اپنے آپ کو جنت کے لیے لائق امیدوار (deserving candidate) ثابت کرے۔

قرآن کی یہ آیت اس سلسلے میں رہنما آیت کی حیثیت رکھتی ہے: **خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم أیکم أحسن عملاً** (67:2)۔ قرآن کی اِس آیت کے مطابق، موجودہ دنیا ایک انتخابی مقام (selection ground) ہے۔ یہاں آزادی کے ماحول میں انسان کو رکھ کر یہ دیکھا جارہا ہے کہ کون اپنے آپ کو احسن العمل (best in conduct) ثابت کرتا ہے۔

زندگی کا یہ تصور، زندگی کو نہایت بامعنی بنا دیتا ہے۔ برٹش سائنس داں سر جیمز جینز (James Jeans) نے دیکھا کہ انسان اس دنیا میں آتا ہے اور اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دماغ کو استعمال نہیں کر پاتا، اس کی خواہشوں کو فُل فِل مینٹ (fulfillment) نہیں ملتا اور وہ مر کر اِس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر اُس نے کہا کہ — انسان بھٹک کر ایک ایسی دنیا میں آ گیا ہے جو اُس کے لیے بنائی نہیں گئی تھی:

Man has strayed into a world which has not been made for him.

لیکن قرآن کے مذکورہ تصورِ حیات کی روشنی میں دیکھئے تو انسانی زندگی ایک انتہائی بامعنی واقعہ بن جاتی ہے۔

قرآن میں خدا کی صفت احسن الخالقین (95:4) بتائی گئی ہے۔ دوسری طرف انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ احسن العمل (67:2) بنے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ خدا کی جو صفت خدائی سطح پر ہے، وہی صفت انسان سے انسانی سطح پر مطلوب ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ خدا کی یہ صفت، قدرت کی سطح پر ظاہر ہوتی ہے اور انسان کے اندر یہ صفت، اطاعت (obedience) کی سطح پر۔

ایک مشہور قول ہے: **تخلّقوا بأخلاق اللہ** (**شرح العقیدۃ الطحاویۃ**، جلد 1، صفحہ 120) یعنی اللہ والے اخلاق کو اپناؤ۔ یہ قول حدیث رسول نہیں ہے، لیکن وہ قرآن کے مذکورہ بیان سے مطابقت رکھتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اخلاقِ خداوندی کے مشابہ بنائے، کسی مجبوری کے بغیر وہ اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرتے ہوئے احسن العمل بنے۔ جو لوگ

اِس معیار پر پورے اتریں، وہ خدا کے مطلوب انسان قرار پائیں گے۔ ان کو آخرت کی معیاری دنیا میں خدا کے پڑوس میں جگہ ملے گی (66: 11)۔ وہ اِس قابل ٹھہریں گے کہ ان کو خدا کی مہمان داری (hospitality) کا شرف حاصل ہوگا (41: 32)۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری کائنات اللہ کی اطاعت کر رہی ہے (30: 26)۔ اِس اعتبار سے، مادّی کائنات انسان کے لیے اطاعتِ الٰہی کے ایک ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انسان کامل آزادی کے باوجود خود اپنے اختیار سے اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت میں دے دیتا ہے، جب کہ بقیہ کائنات جبر (compulsion) کے تحت یہ اطاعت کر رہی ہے۔

اختیارانہ اطاعت (submission by choice) ایک استثنائی ظاہرہ ہے جس کا ثبوت اِس دنیا میں صرف انسان دیتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز، ذرہ سے لے کر ستاروں (stars) اور سیاروں (planets) تک، کامل طور پر خالق کی عظمت بیان کر رہی ہے، مگر اُن کا یہ بیان خاموش زبان میں ہے۔ ایسی ایک دنیا میں انسان کھڑا ہو کر نُطق (speech) کی زبان میں کہتا ہے کہ — خدایا، تو سب سے بڑا ہے۔ میں تیری عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے آپ کو تیرے آگے جھکاتا ہوں۔ یہ صرف انسان ہے جو شعور کی سطح پر خالق کو دریافت کرتا ہے اور پھر اپنے شعور کی سطح پر خالق کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے آگے مکمل طور پر اپنے آپ کو سرینڈر (surrender) کر دیتا ہے۔ یہی شعوری سرینڈر جنت کی قیمت ہے۔

انبیاء کا دور

خالق کے منصوبہ (creation plan) کے مطابق، انسان کو ٹسٹ (test) کے لیے اِس دنیا میں رکھا گیا ہے۔ ٹسٹ کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اُس کا معیار (criterion) کیا ہے۔ وہ معیار یہ ہے کہ کون شخص ملی ہوئی آزادی کا صحیح استعمال کرتا ہے اور کون شخص اِس ملی ہوئی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے۔ صحیح اور غلط کا فرق جاننے کے لیے خالق نے پہلا انتظام یہ کیا کہ انسان کی فطرت میں صحیح اور غلط کی تمیز رکھ دی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **فألهمها**

فجورها وتقواها (91:8) صحیح اور غلط کو جاننے کے لیے فطرت کی یہ رہنمائی گویا کہ ایک غیر منطوق رہنمائی (unspoken guidance) ہے۔ یہ رہنمائی پیدائشی طور پر ہر عورت اور مرد کے اندر یکساں طور پر موجود رہتی ہے۔

اِسی کے ساتھ خالق نے منطوق رہنمائی (spoken guidance) کا انتظام کیا۔ اِس دوسرے انتظام کے تحت، اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اور ہر بستی میں اپنے پیغمبر بھیجے (24:35)۔ اِن پیغمبروں کو وحی (revelation) کے ذریعے وہ رہنمائی بھیجی گئی جس کو قرآن میں الصراط المستقیم (5:1) کہا گیا ہے۔ یہ پیغمبر تاریخِ انسانی کے ہر دور میں مسلسل آتے رہے (44:23)۔ آدم، پہلے انسان بھی تھے اور پہلے پیغمبر بھی۔ اِس کے بعد حضرت محمد تک جو پیغمبر آئے، اُن کی تعداد حدیث میں تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار (1,24000) بتائی گئی ہے (أصول الدين للبغدادی، صفحہ: 157)۔ قرآن میں نام کے ساتھ 25 پیغمبروں کا حوالہ آیا ہے۔

تاہم جدید ذہن کے نزدیک، یہ تمام پیغمبر غیر تاریخی پیغمبر کی حیثیت رکھتے ہیں، اُن کے نزدیک اِن پیغمبروں کو تاریخی پیغمبر (historical prophets) کا درجہ حاصل نہیں۔ پیغمبروں کی پوری تاریخ میں صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا استثنا ہے۔ پیغمبر اسلام محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب مکمل طور پر ایک تاریخی پیغمبر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس حقیقت کا اعتراف ایک مغربی اسکالر نے اِن الفاظ میں کیا ہے کہ — محمد تاریخ کی مکمل روشنی میں پیدا ہوئے:

Muhammad was born within the full light of history.

پچھلے پیغمبروں کا ذکر تاریخ میں کیوں موجود نہیں، اِس کا سبب تاریخ نگاری کا قدیم ذوق ہے۔ قدیم زمانے میں صرف بادشاہوں کے حالات یا جنگ اور فتح کے واقعات قابلِ ذکر سمجھے جاتے تھے۔ چوں کہ پچھلے پیغمبروں کے ساتھ اِس طرح کے سیاسی واقعات جمع نہیں ہوئے، اِسی لیے قدیم مورخین نے پیغمبر کو تاریخی طور پر قابلِ ذکر نہیں سمجھا۔ آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بڑے بڑے سیاسی واقعات پیش آئے، اِس لیے آپ کے ہم عصر مورخین نے آپ کے ظہور کو ایک تاریخی واقعہ کی

حیثیت دی اور اپنی کتابوں میں ایک واقعہ کے طور پر اس کا اندراج کیا۔

خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے، سب ایک ہی پیغام لے کر آئے اور وہ توحید کا پیغام تھا، یعنی انسان کو چاہیے کہ وہ ایک خدا کا عابد بن کر دنیا میں زندگی گزارے۔ لیکن پچھلے پیغمبروں میں سے کسی پیغمبر کے ساتھ کوئی مضبوط ٹیم جمع نہ ہوسکی، اِس لیے ہر پیغمبر کا مشن عملاً توحید کے اعلان (announcement) کے درجے تک پہنچا، وہ توحید پر مبنی انقلاب کے درجے تک نہ پہنچ سکا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ غیر موحّدانہ آئڈیالوجی پر چلتی رہی، تاریخ کا سفر موحدانہ آئڈیالوجی پر جاری نہ ہوسکا۔

خدا کی یہ سنت ہے کہ وہ دعوت کے لیے اٹھنے والوں کی تائید فرماتا ہے۔ پچھلے پیغمبروں کو اِس مقصد کے لیے جو تائید دی گئی، وہ معجزہ (miracle) تھا۔ مثلاً حضرت موسیٰ کو یہ معجزہ کہ اُن کا عصا ایک زندہ سانپ بن کر زمین پر چلنے لگا۔ مگر اِس طرح کے خارقِ عادت معجزات کے باوجود لوگ پیغمبر کی دعوت کو قبول کرنے پر راضی نہ ہوسکے، معجزہ کو انھوں نے جادو (magic) قرار دے کر رد کر دیا۔

نئی منصوبہ بندی

خالق کا وجود ایک ناقابلِ مشاہدہ وجود ہے۔ اِس کے مقابلے میں، مخلوق ایک قابلِ مشاہدہ چیز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس بنا پر تاریخ کے آغاز ہی سے ایسا ہوا کہ انسان، مخلوق پرستی یا فطرت پرستی (nature worship) میں مبتلا ہوگیا۔ عبودیت کے فطری جذبات جو خالق کے لیے تھے، اُس کو انسان نے مخلوق کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ قرآن کی ایک آیت میں اِس حقیقت کی طرف اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: ربّ إنّهن أضللن كثيراً (14: 36) یعنی جو چیزیں انسان کو زیادہ نمایاں دکھائی دیں، اُن کو اُس نے خدائی کا درجہ دے کر پوجنا شروع کر دیا۔ مثلاً سورج، چاند، ستارہ، پہاڑ اور سمندر، وغیرہ۔

اِس طرح تاریخ میں انسان کبھی عمومی طور پر مذہبِ توحید کو اختیار نہ کرسکا۔ تمام انسانی آبادیوں میں ایک ہی مذہب رائج ہوا، اور وہ مظاہر پرستی کا مذہب تھا۔ اِسی مظاہر پرستی کو قرآن میں شرک یا مشرکانہ مذہب کا نام دیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ نسل در نسل جاری رہا، یہاں تک کہ شرک کی روایات

تاریخ کے تسلسل میں شامل ہوگئیں۔ اِسی واقعہ کو قرآن کی ایک آیت میں، اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **ولا یلدوا إلّا فاجراً کفّاراً** (71:27)۔ اِسی تاثر پذیری کو موجودہ زمانے میں کنڈیشننگ (conditioning) کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں ہر پیدا ہونے والا مشرکانہ روایات کے ماحول میں پیدا ہوتا تھا اور دھیرے دھیرے وہ اُسی میں پختہ ہوجاتا تھا۔ اِس طرح ہر انسان کنڈیشننگ (conditioning) کا کیس بن گیا۔ اِسی کنڈیشننگ کی طرف ایک حدیث میں اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: **کُلُّ مولودٍ یولد علی الفطرة، فأبواہ یھوّدانه، وینصرانه، ویمجّسانه (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 1319)**۔

حضرت ابراہیم بن آزر (وفات: 1985 ق م) قدیم عراق میں پیغمبر بنا کر بھیجے گئے۔ اُن کی غیر معمولی دعوتی کوشش کے باوجود ان کی قوم انکار کی روش پر قائم رہی۔ اُن کے زمانے تک یہ واضح ہوگیا کہ مجرد دعوت یا انذار وتبشیر لوگوں کی مشرکانہ کنڈیشننگ کو توڑنے کے لیے کافی نہیں۔ نسل در نسل کے روایتی تسلسل نے لوگوں کے ذہن کو شرک پر اتنا زیادہ پختہ کردیا ہے کہ اب اُن کے ذہنی شاکلہ (framework) کو توڑنے یا ان کی ڈی کنڈیشننگ کرنے کے لیے ایک اور انقلابی منصوبہ درکار ہے۔ یہی وہ خدائی فیصلہ تھا جس کے تحت ہاجرہ اور اسماعیل کو عرب کے صحرا میں بسایا گیا۔

خدا کے حکم سے حضرت ابراہیم اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے چھوٹے بیٹے اسماعیل کو لے کر فرشتہ جبریل کی رہنمائی میں شام سے نکلے۔ جب بھی وہ راستے میں کسی بستی سے گزرتے تو وہ جبریل سے پوچھتے کہ اے جبریل، کیا مجھ کو یہاں ٹھہرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جبریل کہتے کہ نہیں۔ اِس طرح چلتے ہوئے وہ موجودہ مکہ کے مقام پر پہنچے۔ اُس وقت یہاں کوئی آبادی نہ تھی، صرف صحرا تھا یا خشک پہاڑ۔ بالآخر جبریل کے حکم سے حضرت ابراہیم نے اپنی بیوی اور اپنے چھوٹے بچے اسماعیل کو یہاں بسا دیا۔

حضرت ابراہیم جب اِس طرح ہاجرہ کو چھوڑ کر وہاں سے جانے لگے تو ہاجرہ نے پوچھا کہ آپ ہم کو اِس صحرا (desert) میں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں۔ ہاجرہ نے کئی بار پوچھا، مگر حضرت ابراہیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر میں ہاجرہ نے کہا کہ کیا آپ کو اللہ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے

(اللہ أمرك بهذا) حضرت ابراہیم نے کہا کہ ہاں۔ یہ سن کر ہاجرہ نے کہا: إذن لا يُضيِّعُنا الله (صحيح البخاری، رقم الحديث: 3364) یعنی پھر اللہ ہم کو ضائع نہیں کرے گا۔

یہ واقعہ چار ہزار سال پہلے عرب کے صحرا میں پیش آیا۔ اِس کے بعد تحریکِ توحید کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اِس نئے دور کو ایک جملے میں اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے — ایک ایسی قوم تیار کرنا جو مشرکانہ ماحول کی کنڈیشننگ سے پاک ہو۔ یہ مقام جہاں ہاجرہ اپنے چھوٹے بچے کو لے کر آباد ہوئیں، وہ متمدن شہروں سے بہت دور تھا۔ یہاں دن کے وقت صحرا اور پہاڑ اور سورج دکھائی دیتے تھے اور رات کے وقت چاند اور ستارے نظر آتے تھے۔ اِس طرح ایک بے آمیز ماحول میں توالد وتناسل کے ذریعے ایک نئی نسل بننا شروع ہوئی، جو تاریخ میں بنو اسماعیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ اِس نسل کی پرورش ایک انتہائی سادہ اور غیر متمدن ماحول میں ہوئی۔ اِس بنا پر وہ مشرکانہ ماحول کی کنڈیشننگ سے محفوظ رہی۔

عام طور پر مورخین اِس نسل کو ایک منفرد نسل کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔ اِس نسل کے افراد میں انسانی اوصاف اعلیٰ درجے میں موجود تھے۔ قدیم عرب اِن اوصاف کو 'المروءة' کہتے تھے۔ زیادہ درست طور پر اس کو 'الفطرة' کہا جاسکتا ہے۔ اُس دور کے بنو اسماعیل کی اِن غیر معمولی صفات کی بنا پر ایک مغربی اسکالر نے اُن کو ہیروں کی قوم (a nation of heroes) کا نام دیا ہے۔

ہاجرہ اور اسماعیل کے لیے یہ صحرائی زندگی غیر معمولی قربانی کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ قربانی کسی میدانِ جنگ میں لڑ کر مرجانے سے ہزاروں گنا زیادہ بڑی قربانی تھی۔ اِسی لیے قرآن میں اُس کو ذِبحٍ عظیم (37: 107) کہا گیا ہے، یعنی عظیم قربانی۔ قرآن کی اِس آیت میں ذبحِ عظیم سے مراد مینڈھے کا ذبیحہ نہیں، بلکہ وہ خود اسماعیل کا ذبیحہ ہے۔ چار ہزار سال پہلے حضرت اسماعیل کا بے آب وگیاہ صحرا میں آباد ہونا بلاشبہہ ایک عظیم ترین قربانی کا درجہ رکھتا تھا، جسمانی معنوں میں نہیں، بلکہ روحانی معنوں میں۔

آخری رسول کا ظہور

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایک اعتبار سے، دوسرے رسولوں کی طرح ایک رسول تھے، آپ کی مزید

صفت یہ تھی کہ اسی کے ساتھ آپ خاتم النبیین (33:40) تھے۔ خاتم النبیین کا مطلب صرف یہ نہیں کہ آپ پیغمبروں کی لسٹ کے آخری فرد تھے، پیغمبر اسلام کی اصل حیثیت یہ ہے کہ آپ دو دوروں کے درمیان حدِ فاصل (line of demarcation) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کے اوپر دعوتِ توحید کا ایک دور ختم ہوا۔ آپ کے بعد دوسرے دورِ دعوت کا آغاز ہوا جو قیامت تک مختلف صورتوں میں جاری رہے گا۔

یہاں سوال یہ ہے کہ ختمِ رسالت کے باوجود انسانی نسل کا سلسلہ برابر جاری ہے، پھر آپ کے بعد آنے والی نسلوں کی پیغمبرانہ ہدایت کی صورت کیا ہو۔ اِس کا جواب قرآن کی اِس آیت میں ملتا ہے: **عسىٰ أن يبعثك ربّك مقاماً محموداً** (17:79)۔ قرآن کی اس آیت میں ''مقامِ محمود'' سے مراد کوئی پراسرار مقام نہیں ہے، بلکہ ایک معلوم مقام ہے۔ اِس کا مطلب ہے — تاریخی طور پر مانا ہوا پیغمبر (historically acknowledged prophet)۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو پیغمبر آئے، اُن کی پیغمبرانہ حیثیت کا تعلق دنیا میں ان کی جسمانی موجودگی سے تھا۔ اُن کی وفات کے بعد اُن پر یقین کرنے کے لیے تاریخی شہادت درکار تھی، مگر تاریخی ریکارڈ میں ان کا حوالہ موجود نہ تھا، اِس لیے بعد کی نسلوں کے لیے اُن کی حیثیت تاریخی اعتبار سے، ایک غیر تسلیم شدہ پیغمبر کی ہوگئی۔ جب آدمی زندہ موجود نہ ہو تو صرف تاریخ اس کی زندگی کا ثبوت ہوتی ہے۔ اِس بنا پر یہ ہوا کہ انبیاء سابقین اپنی بعد کی نسلوں کے لیے خالص تاریخی اعتبار سے، ہدایت کے مستند مرجع (authentic reference) کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔

مثال کے طور پر مشہور برٹش فلسفی برٹرنڈ رسل (وفات: 1970) نے اپنی کتاب 'میں مسیحی کیوں نہیں' (Why I am not a Christian) میں حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں لکھا ہے کہ — تاریخی اعتبار سے یہ امر سخت مشتبہ ہے کہ مسیح کا کبھی وجود بھی تھا:

Historically, it is quite doubtful whether Christ ever existed at all.

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مقامِ محمود پر کھڑا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ساتھ ایسے اسباب اکھٹا کئے جائیں کہ آپ کو تاریخی طور پر ایک مسلّم پیغمبر کی حیثیت حاصل ہو جائے، تاکہ آپ اپنی

وفات کے بعد آنے والی نسلوں کے لیے بھی اُسی طرح ایک قابلِ حوالہ پیغمبر کی حیثیت سے باقی رہیں، جیسا کہ آپ اپنی زندگی میں ایک قابلِ حوالہ پیغمبر کی حیثیت رکھتے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم واحد پیغمبر ہیں جن کی زندگی اور مشن کے بارے میں مکمل تاریخی ریکارڈ موجود ہے۔ اِسی مسلّمہ تاریخی ریکارڈ کو قرآن میں 'مقامِ محمود' کہا گیا ہے۔ یہی ختمِ نبوت کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ جب ایک پیغمبر کی زندگی اور اس کے مشن سے متعلق تمام تفصیلات قابلِ اعتماد صورت میں لکھی ہوئی محفوظ ہو جائیں، تو اس کے بعد یہ مستند تاریخی ریکارڈ پیغمبر کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ اِس کے بعد یہ ضرورت باقی نہیں رہتی کہ دوسرا پیغمبر آئے۔

اصحابِ رسول کا دور

مشہور صحابی رسول عبداللہ بن مسعود کی ایک روایت اِن الفاظ میں آئی ہے: **إنّ اللّٰه نظر فی قلوب العباد فاختار محمداً صلی الله علیه وسلم فبعثه برسالته وانتخبه بعلمه، ثم نظر فی قلوب الناس بعده فاختار الله له أصحاباً، فجعله أنصار دینه و وزراء نبیّه** (**الاستیعاب لابن عبدالبرّ**، جلد 1، صفحہ 6) یعنی اللہ نے بندوں کے دلوں کو دیکھا، پس اُس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چن لیا۔ پیغمبری کے لیے آپ کی بعثت فرمائی اور آپ کو اپنے علم کے مطابق منتخب کر لیا۔ اِس کے بعد اللہ نے لوگوں کے دلوں کو دیکھا، اور رسول اللہ کے لیے آپ کے اصحاب کو چن لیا۔ اُن کو اپنے دین کا مددگار اور اپنے نبی کا وزیر بنایا۔

اِس روایت سے اور اِس طرح کی دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ رسول ایک منتخب گروہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ اصحابِ رسول کون لوگ تھے۔ یہ بنو اسماعیل کی اُس نسل میں پیدا ہونے والے افراد تھے جو خصوصی منصوبہ کے تحت، عرب کے صحرا میں تیار کئے گئے۔ ان کے اندر استثنائی طور پر وہ انسانی کردار موجود تھا جو دعوتِ توحید کی بنیاد پر ایک ٹیم بنانے کے لیے درکار تھا۔ اِس کردار کے اہم پہلو قرآن کی ایک آیت میں اِن الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں: **محمد رسول الله، والذین معه أشداء علی الکفار رحماء بینهم** (48:29)

اِس آیت میں 'والذین معہ' سے مراد ہے— تاریخی عظمت قائم ہونے سے پہلے خالص جوہر (merit) کی بنیاد پر پیغمبر کو پہچاننا، اور اس کی تصدیق کر کے اس کے مشن میں کامل طور پر اس کا ساتھی بن جانا۔ صحابہ کی جماعت میں یہ صفت ایک تاریخی استثناء کی حیثیت رکھتی ہے۔ پیغمبر اسلام سے پہلے جو پیغمبر آئے، ان کے معاصرین ان کو پہچاننے میں ناکام رہے۔ صحابہ کے اندر یہ صفت ان کی صحرائی تربیت کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ اِس صحرائی تربیت نے اُن کو آخری حد تک حقیقت پسند (realist) بنا دیا۔ وہ اِس قابل ہو گئے کہ ایک حقیقت کو وہ اس کی مجرد صورت میں پہچان سکیں۔ عام طور پر لوگ کسی انسان کو صرف اُس وقت پہچانتے ہیں جب کہ بعد کو اس کے گرد تاریخ کی عظمتیں جمع ہو گئی ہوں۔ صحابہ وہ معاصر اہلِ ایمان تھے جنھوں نے تاریخی عظمت سے پہلے پیغمبر کو اس کی ساعتِ عسرہ (9: 117) میں پہچانا اور اس کے مشن کے لیے اپنے آپ کو پوری طرح وقف کر دیا۔

'أشداء علی الکفار' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صحابہ منکرین پر سخت یا بے رحم تھے۔ عربی زبان میں کہا جاتا ہے کہ: هو شديد عليّ (وہ میرا اثر قبول نہیں کرتا)۔ اِس اعتبار سے، اشداء علی الکفار کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ اہلِ انکار کے لیے غیر اثر پذیر افراد کی حیثیت رکھتے تھے۔ اُن کا شعور اتنا زیادہ بیدار تھا کہ وہ ماحول کا اثر قبول کئے بغیر اپنے اسلامی کردار پر قائم رہ سکتے تھے۔

اِس واقعہ کو دوسرے الفاظ میں، اِس طرح کہہ سکتے ہیں کہ صحابہ اپنے ماحول کی کنڈیشننگ (conditioning) کو قبول نہیں کرتے تھے۔ وہ پوری طرح کنڈیشننگ سے پاک شخصیت (de-conditioned personality) کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے اندر یہ استثنائی صفت ان کی صحرائی تربیت کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ یہ لوگ بنو اسماعیل کی نسل سے تعلق رکھتے تھے، اور بنو اسماعیل کے لیے ان کے صحرائی ماحول میں وہ تمدنی اسباب سرے سے موجود ہی نہ تھے جو لوگوں کی کنڈیشننگ کریں اور اِس طرح اُن کو ان کی فطرت سے ہٹا دیں۔

'رُحماء بینھم' کا مطلب سادہ طور پر یہ نہیں ہے کہ صحابہ دوسروں کے لیے مہربان تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کے لیے مہربان ہونا، ایک نہایت مشکل کام ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں بار بار دوسروں کی طرف سے ناپسندیدہ روش کا تجربہ ہوتا ہے۔ اِس بنا پر عمومی طور پر یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کے اندر ایک دوسرے کے لیے نفرت اور شکایت پیدا ہوجاتی ہے۔ اِس بنا پر دوسروں کے لیے مہربان ہونا، صرف اُس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی شکایتوں سے اوپر اٹھ جائے۔ وہ اتنا زیادہ باشعور ہو کہ وہ منفی تجربات کو مثبت احساس میں تبدیل کر سکے۔

دوسروں کے لیے مہربان ہونے کا مطلب ہے، یک طرفہ طور پر دوسروں کے لیے مہربان ہونا۔ اِس حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ صحابہ کے اندر وہ خصوصی صفت موجود تھی جس کو مثبت سوچ (positive thinking) کہا جاتا ہے۔ صحابہ مثبت ذہن رکھنے والوں (positive thinkers) کا ایک گروہ تھے۔ اِسی یک طرفہ مثبت سوچ کی بنا پر ان کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ شکایات کے باوجود لوگوں کے لیے ہمدرد بن جائیں، لوگوں کی طرف سے ناخوش گوار تجربات پیش آنے کے باوجود وہ لوگوں کے لیے خیر خواہ بنے رہیں۔

فتنہ کا خاتمہ

صحابہ کی جماعت نے جو کام انجام دیا، اُس میں سے ایک خاص کام وہ ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة، ويكون الدين كلّه لله** (8:39)۔ فتنہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو مذہبی جبر (religious persecution) کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں مذہبی جبر، مذہب کی نسبت سے سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ اِسی حقیقت کی طرف قرآن کی سورہ البروج (85: 4-7) میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اِس عمومی مذہبی جبر کی بنا پر قدیم زمانے میں صرف یہی نہیں تھا کہ مذہب کے بارے میں اختیار (choice) ختم ہوگیا تھا، بلکہ ہر پہلو سے آزادانہ غور وفکر کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ حکومتیں اِس مذہبی جبر کی سرپرستی کرتی تھیں، کیوں کہ اربابِ حکومت اس کو اپنے سیاسی اقتدار کے باقی رکھنے کے لیے نہایت مفید سمجھتے تھے۔ جمہوری دور میں ایک سیاسی پارٹی ووٹروں سے مینڈیٹ (mandate) حاصل کرتی ہے۔

قدیم زمانے میں بادشاہ مشرکانہ عقائد سے اپنے لیے حکومت کا حق حاصل کرتے تھے۔

اصحاب رسول کا رول

اصحاب رسول کی تاریخ عملاً چار ہزار سال پہلے، ہاجرہ اُمّ اسماعیل سے شروع ہوتی ہے۔ ہاجرہ کی قربانی اِس مشہور قول کی کامل مصداق ہے کہ — ہر بڑے واقعہ کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے:

There is a woman at the beginning of all great things.

ہاجرہ کی قربانی سے وہ اعلیٰ نسل بنی جو تاریخ میں بنو اسماعیل (Ishmilites) کے نام سے مشہور ہے۔ اِسی نسل سے وہ استثنائی افراد نکلے جن کے مجموعے کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔

اصحابِ رسول کا رول تاریخ میں کیا تھا، وہ ایک حدیثِ رسول سے معلوم ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر (2 ہجری) کے موقع پر دعا کرتے ہوئے اپنے اصحاب کے بارے میں کہا تھا: **اللهم إن تهلك هذه العصابة من أهل الإسلام، لا تُعبد فی الأرض** (صحيح مسلم، رقم الحديث: 1763)۔

اِس قولِ رسول میں **العصابة** سے مراد صحابہ کی جماعت ہے۔ صحابہ نے ہاجرہ کے بعد دوبارہ بے مثال قربانی کے ذریعے عہد ساز رول (epoch-making role) ادا کیا تھا۔ اصحاب رسول کے اِس غیر معمولی رول سے انسانی تاریخ میں وہ انقلاب آیا جس کو فرانسیسی مورخ ہنری پرین (وفات: 1935) نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے — اسلام نے زمین کے نقشہ کو بدل دیا۔ تاریخ کے روایتی ڈھانچے کو اکھاڑ کر پھینک دیا گیا:

Islam changed the face of the globe.
The traditional order of history was overthrone.

صحابہ کی قربانیوں کے ذریعے تاریخ میں جو تبدیلی آئی، اس کو ایک لفظ میں اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ — صحابہ نے تاریخ میں پہلی بار مخلوق کی پرستش (nature worship) کے دور کو ختم کیا اور خالق کی پرستش کے دور کا آغاز کیا۔ بعد کے زمانے میں انسانی تاریخ میں جو دوررس تبدیلیاں آئیں، وہ سب اُسی انقلاب کا نتیجہ تھیں جو صحابہ کے ذریعہ ساتویں صدی عیسوی میں برپا ہوا تھا۔

الحمدللہ کلچر

قرآن کی پہلی آیت یہ ہے: **الحمد للہ رب العالمین** (1:1)۔ یہ آیت دنیا کی زندگی کے بارے میں ربُّ العالمین کے مطلوب کو بتاتی ہے۔ ٹھیک یہی آیت قرآن میں آخرت کے حوالے سے آئی ہے: **وقیل الحمد للہ رب العالمین** (39:75)۔ یہ دوسری آیت آخرت میں خدا کے مطلوب کو بتا رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ خالقِ کائنات کو انسان کی زندگی میں ایک ہی کلچر مطلوب ہے، اور وہ الحمدللہ کلچر ہے، موجودہ دنیا میں بھی الحمدللہ کلچر، اور قیامت کے بعد بننے والی اگلی دنیا میں بھی الحمدللہ کلچر۔

انسانوں کے درمیان اِسی الحمدللہ کلچر کو فروغ دینے کے لیے خدا نے مسلسل اپنے پیغمبر بھیجے۔ اِس کے نتیجے میں کچھ افراد (individuals) ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی ذاتی زندگی میں الحمدللہ کلچر کو اپنایا، لیکن عمومی حیثیت سے، پوری تاریخ میں الحمدلغیر اللہ کلچر چھایا رہا، انسانی زندگی کا پورا نقشہ الحمدلغیر اللہ کلچر کا عملی نمونہ بن کر رہ گیا۔ یہ معاملہ انسان کے بارے میں خدا کے تخلیقی منصوبہ کے سراسر خلاف تھا۔ اس لیے خدا نے تاریخ میں مداخلت کا فیصلہ کیا۔ خدائی مداخلت (divine intervention) کا یہ واقعہ ساتویں صدی عیسوی میں اصحابِ رسول کے ذریعے ظہور میں آیا۔

قرآن میں اصحابِ رسول کے رول کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ، ویکون الدین کلّہ للہ** (8:39) یعنی اُن سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب کا سب اللہ کے لیے ہو جائے۔ اِس آیت میں فتنہ سے مراد شرک ہے، جیسا کہ مفسرینِ قرآن نے عام طور پر بیان کیا ہے۔ شرک کیا ہے، شرک دراصل الحمدلغیر اللہ کلچر کا دوسرا نام ہے۔ انسان، خالق کو دیکھ نہ سکا تو اُس نے دکھائی دینے والی مخلوقات کی پرستش شروع کر دی۔ وہ خالق کے بجائے مخلوق کی عظمت (glory) میں جینے لگا۔ اِسی کا نام شرک ہے۔ اور اِسی کو ہم نے الحمدلغیر اللہ کلچر کا نام دیا ہے۔

حمد کیا ہے

حمد صرف اللہ کے لیے ہے۔ اللہ کے سوا کوئی اور اِس کا سزاوار نہیں کہ اس کی حمد کی جائے۔ حمد

کی اصل مدح ہے، لیکن حمد میں مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اِس لحاظ سے، حمد کا مطلب اعلیٰ تعریف (high praise) ہے۔ جس ہستی کی تعریف کی جائے اُس کے لحاظ سے تعریف کرنے والے کے اندر جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جب ایک شخص اللہ کو اس کی عظمتوں کے ساتھ دریافت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ الحمدللہ، تو یہ سادہ طور پر صرف مدح اور تعریف کا ایک کلمہ نہیں ہوتا، اُس میں شکر و اعتراف، احسان مندی اور جذباتی تعلق جیسے تمام اعلیٰ احساسات لازمی طور پر شامل ہوجاتے ہیں۔ لغت کے اعتبار سے حمد، مدح کے معنی میں ہے، لیکن استعمال کی نسبت سے اس میں معنوی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حمد کے لغوی معنی اگرچہ وہی ہیں جو مدح کے معنی ہیں، لیکن حمد کا لفظ جب رب العالمین کی نسبت سے بولا جائے تو وہ مدح پلس (praise plus) کے ہم معنی بن جائے گا۔

ایک انسان جب اپنے وجود پر غور کرتا ہے، وہ کائنات کے بارے میں سوچتا ہے، وہ تخلیق کے مظاہر میں خالق کو دریافت کرتا ہے، تو اس کے اندر احساسات کا سمندر موج زن ہوجاتا ہے۔ اُس وقت وہ بے تابانہ طور پر کہہ اٹھتا ہے: الحمد للہ ربّ العالمین۔ یہ شعوری حمد خدا کی ہستی کا اعلیٰ ترین اعتراف ہے، اِس کے بعد اعتراف کا اور کوئی درجہ نہیں۔

انسان کی فطرت میں پیدائشی طور پر یہ شعور موجود ہے کہ وہ ایک اعلیٰ ہستی کو پائے اور اس کے لیے اپنی طرف سے کمالِ اعتراف کے جذبات پیش کرے۔ انسان جب ایک خدا کو اپنی اِس فطرت کی پکار کے جواب کے طور پر دریافت کرے، تو اِسی کا نام توحید ہے۔ اور جب انسان اپنے اِن جذبات کو کسی غیرِ خدا کی طرف منسوب (attribute) کردے اور اُس سے وہ تعلق پیدا کرلے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: یحبّونھم کحب اللہ (2:165) تو اِسی کا نام شرک ہے۔ توحید پر مبنی دین، اللہ کا مطلوب دین ہے اور شرک پر مبنی دین، اللہ کا غیر مطلوب دین۔

اصحابِ رسول کا ایک استثنائی رول تھا۔ وہ رول یہ تھا کہ وہ تاریخ میں الحمدلغیر اللہ کلچر کے غیر مطلوب تسلسل کو توڑیں اور الحمدللہ کلچر کے مطلوب دور کا آغاز کریں۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں قتال (جنگ) کا لفظ زمانے کی رعایت سے آیا ہے۔ قدیم زمانے میں یہ صورتِ حال تھی کہ الحمدلغیر اللہ کلچر نے

سیاسی اقتدار (political power) کی سرپرستی حاصل کرلی تھی، اِس لیے الحمدلغیر اللہ کلچر کا خاتمہ کرنے کے لیے وقت کے سیاسی اقتدار سے مسلّح ٹکراؤ پیش آیا۔

ساتویں صدی عیسوی میں دو بڑے سیاسی ایمپائر تھے جو الحمدلغیر اللہ کلچر کے فعّال سرپرست بنے ہوئے تھے۔ یہ تھے — رومن ایمپائر، اور ساسانی ایمپائر۔ وہ اپنے اقتدار کی بقا کے لیے ضروری سمجھتے تھے کہ الحمدلغیر اللہ کلچر کا رواج پوری طرح قائم رہے۔ چناں چہ انھوں نے عرب کے صحرا میں اٹھنے والی تحریکِ توحید یا الحمدللہ کلچر کو اپنے لیے ایک سنگین خطرہ سمجھا اور اس کے خلاف خود اپنی طرف سے مسلّح کارروائی کا آغاز کردیا۔ اِس کے نتیجے میں اصحابِ رسول کو رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کے مقابلے میں دفاعی طور پر جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ ایک بے حد مشکل کام تھا۔ رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کے مقابلے میں اصحاب رسول کی طاقت تقریباً صفر (zero) کی حیثیت رکھتی تھی۔ اِس موقع پر اللہ تعالیٰ نے خصوصی مدد کی۔ ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ دونوں ایمپائر دس سال کے اندر دوبار خود ایک دوسرے کے خلاف مسلح جنگ میں مبتلا ہوگئے۔ اِس باہمی ٹکراؤ نے دونوں کو آخری حد تک کمزور کردیا۔ باہمی جنگ کے ذریعے پیش آنے والی یہی دوطرفہ مغلوبیت ہے جس کی طرف قرآن کی سورہ الروم کی ابتدائی آیتوں میں اشارہ کیا گیا ہے (30:2-5)۔

بائبل میں کئی ایسی پیشین گوئیاں ہیں جن کا تعلق اصحابِ رسول سے ہے۔ اُن میں سے ایک پیشین گوئی وہ ہے جس کا تعلق رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کی مغلوبیت کے اِسی واقعے سے ہے۔ اِس واقعے کو بائبل میں تمثیل کی زبان میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے — اُس نے نگاہ کی اور قومیں پراگندہ ہوگئیں، ازلی پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگئے، قدیم ٹیلے جھک گئے:

He looked and startled the nations. And the everlasting mountains were scattered. (Habakkuk 3:6)

خلیفہ ثانی عمر بن الخطاب کے زمانہ خلافت (644-634ء) میں صحابہ کی جماعت ایران میں داخل ہوئی۔ ان کی فتوحات کو دیکھ کر ایران کا سپہ سالار رستم مرعوب ہوگیا۔ اس نے صحابہ کے وفد کو اپنے دربار میں گفت وشنید کے لیے بلایا۔ گفتگو کے دوران رستم نے صحابی رسول ربعی بن عامر سے پوچھا

کہ تم لوگ ہمارے ملک میں کیوں داخل ہوئے۔ ربعی بن عامر نے بے خوفی کے ساتھ جواب دیا: **الله ابتعثنا لنخرج مَن شاء من عبادة العباد إلىٰ عبادة الله** (اللہ نے ہم کو بھیجا ہے، تاکہ وہ جس کو چاہے ہم اُس کو بندوں کی عبادت سے نکال کر خدا کی عبادت کی طرف لے آئیں۔

صحابی رسول کے اِس قول کو اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ اللہ نے اپنے ایک منصوبے کے تحت ہم کو اٹھایا ہے، وہ منصوبہ یہ ہے کہ دنیا سے الحمدلغیر اللہ کلچر کے غیر مطلوب دور کا خاتمہ ہو، اور دنیا میں الحمدللہ کلچر کا ربانی دور شروع ہو جائے۔ اصحابِ رسول کا یہ اقدام اپنی حقیقت کے اعتبار سے، کسی قسم کا سیاسی غلبہ قائم کرنے کے معنی میں نہ تھا، بلکہ وہ زیادہ وسیع تر معنی میں تھا۔ اصحاب رسول کا مشن یہ تھا کہ وہ دنیا میں ایک نئی تہذیب (civilization) کا غلبہ قائم کریں۔ یہ ایک دورِ تہذیب کی جگہ دوسرے دور تہذیب کو لانا تھا، نہ کہ محدود معنوں میں ایک حکومت کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسری حکومت کو لانا، یعنی الحمدلغیر اللہ پر مبنی تہذیب کی جگہ الحمدللہ پر مبنی تہذیب۔

حقیقی تصویر، تاریخی تصویر

آج جب اصحابِ رسول کا نام لیا جاتا ہے تو اُس وقت تک اُس کو مکمل نہیں سمجھا جاتا، جب تک کہ اُن کے نام کے ساتھ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جیسے تعظیمی الفاظ شامل نہ کیے جائیں۔ آج اصحاب رسول کا لفظ مسلّمہ طور پر ایک پُرعظمت لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اصحابِ رسول کی یہ تصویر اُس وقت بنی ہے، جب کہ اُن کے ساتھ بعد کی تاریخی عظمتیں شامل ہوگئیں۔ لیکن اصحاب رسول کی تصویر اُن کے معاصرین کے لیے بالکل عام انسانوں جیسی تھی۔ صلح حدیبیہ (6 ہجری) کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان صلح کی گفتگو ہوئی تھی۔ اُس وقت آپ کے ساتھ چودہ سو اصحاب تھے۔ اُس موقع پر قریش کے نمائندہ عروہ بن مسعود الثقفی نے صحابہ کو دیکھ کر حقارت کے ساتھ اُن کو أشواب یعنی محض ایک بھیڑ (crowd) کا نام دیا تھا۔ (**السيرة النبوية لابن كثير** 3/317)

یہی معاملہ یقینی طور پر بعد کے زمانے کے گروہ، اخوان رسول کے ساتھ بھی پیش آئے گا۔ اُن کے معاصرین کی اکثریت ان کو پہچاننے میں ناکام رہے گی۔ یہ عام انسانی کمزوری ہے۔ مشہور مثل ہے کہ پیغمبر

اپنے زمانے میں پہچانا نہیں جاتا (A prophet is never honored in his own land)۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ اپنے معاصرین کو عام انسانوں جیسا دکھائی دیتا ہے۔ جب بعد کا زمانہ آتا ہے تو ایسے فرد یا گروہ کے ساتھ بعد کو پیش آنے والے تاریخی واقعات اُن کے نام کے ساتھ شامل ہوجاتے ہیں۔ بعد کے زمانے کے لوگ جب اُن کا نام لیتے ہیں تو ایک تاریخی انسان یا تاریخی گروہ کا تصور ان کے ذہن میں آتا ہے، نہ کہ اُس انسان یا اُس گروہ کا تصور جو کہ خود اپنے زمانے میں پایا جاتا تھا۔ حقیقی انسان اور تاریخی انسان کا یہی فرق دوبارہ کام کرے گا اور لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ سابق اصحاب رسول کی عظمت تو خوب بیان کریں گے، لیکن وہ اپنے معاصر اخوان رسول کو کم تر سمجھ کر اُنھیں نظر انداز کردیں گے۔

مشترک تائیدی عمل

ساتویں صدی عیسوی میں اصحاب رسول کی جماعت کا بننا کوئی سادہ واقعہ نہ تھا، وہ ایک لمبے تائیدی عمل کے ذریعے انجام پایا۔ یہ تائیدی عمل تھا— صحرائی حالات میں خصوصی تربیت کے ذریعے بنو اسماعیل کی نسل کو وجود میں لانا۔ اس نسل کی خاص صفت یہ تھی کہ وہ غیر فطری ماحول کی کنڈیشننگ سے پاک تھی۔ اِس بنا پر یہ لوگ حق کو قبول کرنے کی استثنائی صلاحیت رکھتے تھے۔ اِسی صلاحیتِ قبولیت کو قرآن میں تمثیل کی زبان میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: **یکاد زیتھا یضیئ ولو لم تمسسہ نار** (24:35)۔

بیسویں صدی عیسوی میں ڈی کنڈیشننگ کا یہ واقعہ ایک اور نظام کے تحت پیش آیا۔ یہ سیکولر تہذیب کے تحت سیکولر تعلیم اور سیکولر افکار (secular thoughts) کا نظام تھا۔ موجودہ زمانے کے سیکولر تعلیمی اداروں کو بعض لوگوں نے منفی نام دے کر ''قتل گاہ'' (slaughter house) بتایا۔ اِسی طرح انھوں نے جدید سیکولر تہذیب کو اسلام دشمن تہذیب کہا۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ ادارے ڈی کنڈیشننگ کے ادارے (institutions of de-conditioning) تھے۔ اِن جدید تعلیمی اداروں نے یہ کیا کہ وہاں تعلیم پانے والے افراد کے سابق شاکلہ کو توڑ کر اُن کو اِس قابل بنایا کہ وہ کھلے ذہن کے تحت سوچیں اور تعصّبات (prejudices) سے خالی ہوکر چیزوں کو ایز اِٹ اِز (as it is)

دیکھ سکیں۔ ڈی کنڈیشننگ کا یہی کام جدید سیکولر تہذیب نے بھی انجام دیا۔

اِس طرح جدید سیکولر اداروں میں تعلیم پا کر جو افراد تیار ہوئے، وہ گویا کہ بیسویں صدی کے ''بنو اسماعیل'' تھے۔ یہ لوگ اپنی تربیت کے تحت، غیر متعصّبانہ ذہن رکھتے تھے۔ وہ اِس قابل تھے کہ اُن کے سامنے بے آمیز حق پیش کیا جائے تو وہ اُس کے بارے میں آزادانہ طور پر سوچیں اور اس کو قبول کرلیں۔ اِس طرح یہ جدید نسل اُن لوگوں کے لیے ایک موافق نسل بن گئی جن کو موجودہ زمانے میں اخوانِ رسول کا رول ادا کرنا تھا۔ یہ ایک مشترک تائیدی عمل کا واقعہ ہے جو دونوں گروہوں کے لیے خصوصی خدائی منصوبے کے تحت پیش آیا۔

مسلم دورِ اقتدار

رسول اور اصحاب رسول 622 عیسوی میں مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ آ گئے۔ اس کے بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ مدینہ میں مسلمانوں کا ایک سٹی اسٹیٹ (city state) قائم ہو گیا، یعنی شہری ریاست۔ 632 عیسوی میں جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو پورا عرب مدینہ کے سیاسی سنٹر کے تحت آ چکا تھا۔ اِس کے بعد مسلمانوں کا سیاسی اقتدار تیزی سے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ وہ ایشیا اور افریقہ اور یورپ کے بڑے حصے میں پھیل گیا۔ یہ مسلم اقتدار مختلف نشیب و فراز کے ساتھ تقریباً ایک ہزار سال تک باقی رہا۔

یہ مسلم سیاسی اقتدار اپنی وسعت کے اعتبار سے ایک ایمپائر (empire) کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ اصولاً اسلام کی آئڈیالوجی پر قائم تھا۔ اِس طویل دورِ اقتدار میں انسانیت کو بہت سے مثبت فائدے حاصل ہوئے۔ مثلاً انسانی مساوات کے دور کا آنا، توہم پرستی کا خاتمہ، عدل و انصاف کا قیام، وغیرہ۔ اگرچہ فطرت کے عام قانون کے مطابق، مسلم اقتدار کے طویل دور میں بہت سی کمیاں پائی جاتی تھیں، لیکن عملی اعتبار سے اِس دور نے انسانی تاریخ کو ایک نئے دورِ ترقی سے آشنا کیا۔

مسلم دورِ اقتدار کا سب سے زیادہ دوررس رول یہ تھا کہ اُس نے انسانی تاریخ میں پہلی بار علم کو عمومی توسیع کے درجے تک پہنچایا۔ اسلام کے ظہور سے پہلے علم کا دائرہ بہت محدود تھا۔ عام طور پر لوگ

ناخواندہ (illiterate) ہوتے تھے۔ مطالعۂ کتب کا مطلب صرف یہ تھا کہ مذہبی کتابیں برکت کے طور پر پڑھی جائیں یا بادشاہوں کے حالات کا مطالعہ کیا جائے۔

علمی توسیع کا اصل سبب

علم کی اِس توسیع کا اصل سبب بلاشبہہ قرآن تھا۔ قرآن، انسانی تاریخ کی پہلی کتاب ہے۔ جس میں بار بار نہایت تاکید کے ساتھ یہ بات کہی گئی کہ زمین وآسمان کی چیزوں میں غور کرو۔ قرآن نے اِس غور وفکر کو اتنا زیادہ بڑھایا کہ اس کو عبادت کا درجہ دے دیا۔ سورہ آل عمران کے آخری رکوع میں کائنات میں غور وفکر کرنے والوں کو خصوصی مقام دیتے ہوئے فرمایا: **الذين يتفكرون في خلق السماوات والأرض** (3: 191)۔ اور سورہ فاطر میں بارش کے نظام، نباتات اور حیوانات اور پہاڑوں کی ساخت وغیرہ کا مطالعہ کرنے والوں کو علماء (35: 28) کا درجہ دیا گیا۔ قرآن میں پہلی بار اس حیثیت کا انکشاف کیا گیا کہ زمین وآسمان کو اس کے خالق نے انسان کے لیے مسخر (subservient) بنا دیا ہے (45: 13)۔ اس تصور کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیچر انسان کو اپنا خادم نظر آنے لگی، نہ کہ معبود۔

اِس طرح کی آیتیں قرآن میں کثرت سے موجود ہیں۔ قرآن کی اِن آیتوں نے اہلِ ایمان کو علم کے ایک توسیعی مفہوم سے متعارف کیا۔ اِس کے مطابق، پوری کائنات گویا کہ ایک وسیع لائبریری قرار پائی۔ علم ایک محدود شعبہ نہ رہا، بلکہ وہ ایک آفاقی شعبہ بن گیا۔

یہ کوئی سادہ بات نہ تھی۔ اسلام کے ظہور سے پہلے ساری دنیا میں شرک کا رواج تھا۔ شرک دراصل مظاہرِ فطرت کی پرستش (nature worship) کا دوسرا نام ہے۔ شرک کے نظریے کے تحت، فطرت (nature) پرستش کی چیز بنی ہوئی تھی۔ جو چیز پرستش کا موضوع (object of worship) کا درجہ رکھتی ہو، وہ اُسی وقت تحقیق کا موضوع (object of investigation) نہیں بن سکتی۔

مسلم دورِ اقتدار میں، قرآن کی آئڈیالوجی کے تحت، یہ ہوا کہ عمومی طور پر فطرت (nature) کو اُلوہیت (divinity) کے درجے سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ مظاہر فطرت بڑے پیمانے پر تحقیق ومطالعے کا موضوع بن گئے۔ اِس نئے کلچر کا پہلا مرکز مدینہ بنا۔ اس کے بعد وہ دمشق پہنچا۔ اس

کے بعد قاہرہ اور بغداد میں اس کو غیر معمولی فروغ ملا۔ اس کے بعد وہ مسلم اسپین تک پہنچا اور قرطبہ اور غرناطہ اس کا مرکز بنے۔ مسلم اقتدار کے تحت، اِس دورِ علم نے کائنات کی تمام چیزوں کو مطالعہ اور تحقیق کا موضوع بنا دیا، جب کہ اِس سے پہلے اُس کو صرف تقدس اور عبودیت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

اِس حقیقت کا اعتراف مختلف اہلِ علم نے کیا ہے۔ مثال کے طور پر برٹش مورخ آرنلڈ ٹائن بی (وفات: 1975) نے یہ سوال قائم کیا ہے کہ فزیکل سائنس (physical science) تمام تر فطرت (nature) کی دریافت کا نام ہے۔ یہ فطرت ہمیشہ سے دنیا میں موجود تھی۔ انسان، اول دن سے اس کو دیکھ رہا تھا، پھر ایسا کیوں ہوا کہ فطرت کی یہ دریافت بہت زیادہ تاخیر کے ساتھ صرف موجودہ زمانے میں ممکن ہوسکی۔ آرنلڈ ٹائن بی نے اس سوال کا جواب یہ دیا کہ قدیم زمانے میں انسان نے نیچر (فطرت) کو مقدس (sacred) سمجھ لیا تھا۔ وہ نیچر کو خدائی کا درجہ دئے ہوئے تھا۔ اِس بنا پر انسان، نیچر کی تحقیق یا اس کو مسخر کرنے کی بات نہ سوچ سکا۔ ٹائن بی (Arnold Toynbee) کے مطابق، بعد کے زمانے میں جب توحید (monism) کو فکری غلبہ حاصل ہوا اور اس نے شرک کے نظریے کو ختم کیا تو اس کے بعد انسان کے اندر نیچر کے بارے میں ایک نئی سوچ پیدا ہوئی جو آخر کار سائنسی انقلاب کا سبب بنی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب ''اسلام دورِ جدید کا خالق'')۔

انسان مرکزی پلان

خدا کا تخلیقی منصوبہ انسان مرکزی منصوبہ (man-centered plan) ہے۔ اِس حقیقت کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **وسخر لکم ما فی السماوات ومافی الأرض جمیعاً منه** (45:13) یعنی زمین اور آسمان کا پورا نظام انسان کی ضرورت کے مطابق، بنایا گیا ہے۔ ہر چیز براہِ راست یا بالواسطہ طور پر انسان کی کسی نہ کسی ضرورت سے جڑی ہوئی ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب قرآن نازل ہوا، اس وقت یہ بات صرف ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن اکیسویں صدی عیسوی میں یہ چیز ایک سائنسی حقیقت بن چکی ہے۔ جدید ترین سائنسی تحقیقات نے بتایا ہے کہ پوری کائنات کسٹم میڈ (custom-made) کائنات ہے، یعنی مکمل طور پر انسانی تقاضوں کے مطابق۔

انسان کو خدا کے تخلیقی منصوبہ سے آگاہ کرنے کے لیے ہر دور میں خدا کی طرف سے پیغمبر بھیجے گئے۔ یہ پیغمبر عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتے تھے، اِس لیے اُن کے معاصرین اُن کو پہچان نہ سکے۔ انھوں نے ان کا استہزا (35:30) کیا اور ان کو ماننے سے انکار کر دیا۔ دعوتی مشن کے لیے ہمیشہ ایک خارجی تائید کی ضرورت ہوتی ہے، اِس لیے انبیاء کو یہ تائید معجزہ (miracle) کے ذریعے دی گئی۔

آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی حسّی معجزہ نہیں دیا گیا (59 :17)۔ اِس کے برعکس، آپ کے لیے خصوصی منصوبہ کے تحت، قابلِ کار انسانوں کی ایک طاقت ور ٹیم فراہم کی گئی۔ اِس ٹیم کی تائید سے پیغمبر اسلام نے اپنے تاریخی مشن کو مکمل کیا۔ اِسی ٹیم کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔ یہ ٹیم ایک صحرائی کلچر (desert culture) کے ذریعے تیار کی گئی۔ اِس صحرائی کلچر نے گویا کہ تائید کا وہ کام کیا جو پیغمبروں کے زمانے میں معجزہ کے ذریعے انجام پایا تھا۔

اخوان رسول کا دور

تاریخ میں تیسرا رول اُس گروہ کا ہے جس کو حدیث میں اخوانِ رسول کہا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں ایک حدیث رسول اِن الفاظ میں آئی ہے: **وددتُ أنّا قد رأينا إخواننا، قالوا: أو لسنا إخوانك يا رسول الله، قال: أنتم أصحابي، وإخواننا الذين لم يأتوا بعد (صحيح مسلم، رقم الحديث: 249)** یعنی رسول اللہ صلی اللہ نے فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ ہم اپنے اخوان (بھائیوں) کو دیکھیں۔ صحابہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا ہم آپ کے اخوان نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم میرے اصحاب ہو، ہمارے اخوان وہ ہیں جو ابھی نہیں آئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوتی مشن میں ساتھ دینے والے معاصر اہلِ ایمان (contemporary believers) کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔ تاریخ کے آخری دور میں پیغمبر اسلام کے دعوتی مشن کے لیے دوبارہ اٹھنے والے غیر معاصر اہلِ ایمان کو اخوانِ رسول کہا گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دعوت الی اللہ کے مشن کو دوبارہ دریافت کریں گے اور آخری زمانے کے انسانوں تک حق کا پیغام پہنچائیں گے۔ اخوانِ رسول کا مشن ایک اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے جس میں اُن کے

دعوتی مشن کو اِدخالِ کلمہ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

ایک حدیثِ رسول اِن الفاظ میں آئی ہے: **لا یبقیٰ علی ظهر الأرض بیتُ مدرٍ ولا وبَرٍ إلا أدخله الله کلمة الإسلام** (مسند احمد، جلد 6، صفحہ 4) یعنی زمین کی پشت پر کوئی خیمہ یا کوئی گھر باقی نہیں رہے گا جس میں اللہ تعالیٰ اسلام کا کلمہ داخل نہ کردے۔

اِس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آخری زمانے میں اسلام کی سیاسی حکومت ساری دنیا میں قائم ہوجائے گی۔ یہ حدیث واضح طور پر دعوتی توسیع کے معنی میں ہے، نہ کہ حکومتی توسیع کے معنی میں۔ حدیث میں 'کلمۂ اسلام' کا لفظ ہے، نہ کہ حکومت اسلام کا لفظ۔ دعوت کی عالمی توسیع کا یہ کام آخری زمانے میں سائنٹفک کلچر کی تائید سے انجام پائے گا۔ آخری زمانے میں سائنسی تحقیقات کے ذریعے ایسے وسائل اور ایسی ٹکنالوجی دریافت ہوگی جو تاریخ میں پہلی بار اس بات کو ممکن بنادے گی کہ کرہ ارض پر بسے ہوئے تمام انسانوں تک خدا کا پیغام پہنچ جائے۔ خواہ نہ ماننے والے اُس کو نہ مانیں، اور ماننے والے اس کو مان کر خدا کے انعام کے مستحق بنیں۔ اِس پیشین گوئی سے مراد واضح طور پر بیسویں صدی کے نصف آخر میں ظاہر ہونے والا وہ دور ہے جس کو کمپیوٹرائیج (computer age) کہا جاتا ہے۔ تاریخ کا آخری رول الصالحون (21: 105) کے لیے مقدر ہے۔ یہ رول قیامت کے بعد جنت میں ملکوتی کلچر (angelic culture) کی تائید سے انجام پائے گا۔

حدیث رسول کی پیشین گوئی کے مطابق، آخری زمانے میں اخوانِ رسول کا ظاہر ہونا یقینی ہے، تاکہ وہ دعوتی عمل انجام پائے جو آخری زمانے کے لیے مقدر کیا گیا ہے۔ جس طرح ساتویں صدی عیسوی میں اصحاب رسول کے لیے ایک رول مقدر تھا جس کو انھوں نے انجام دیا، اِسی طرح بعد کے زمانے میں اخوانِ رسول کے لیے ایک رول مقدر ہے جس کو وہ اللہ کی توفیق سے انجام دیں گے۔ دنیا میں کوئی فرشتہ ظاہر ہوکر یہ اعلان نہیں کرے گا کہ فلاں گروہ اخوانِ رسول کا گروہ ہے۔ اِس قسم کا اعلان صرف آخرت میں ہوگا۔ البتہ صاحب معرفت افراد اُس کو پہچانیں گے اور اس کا ساتھ دے کر آخرت کے انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔

اخوانِ رسول کا معاملہ کوئی پراسرار معاملہ نہیں۔ قرآن اور حدیث کے مطالعے سے اس کو یقینی طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسانی تاریخ دو بڑے دوروں (periods) میں تقسیم ہے— روایتی دور، اور سائنسی دور۔ امتِ مسلمہ سے ہر زمانے میں ایک ہی کام مطلوب ہے، اور وہ دعوت الی اللہ کا کام ہے۔ روایتی دور میں جن لوگوں نے اِس کام کو پیغمبرانہ نمونے کے مطابق انجام دیا، وہ اصحاب رسول کہے جاتے ہیں۔ اسی طرح بعد کے سائنسی دور میں جو لوگ دعوت کے کام کو پیغمبرانہ نمونے کے مطابق انجام دیں، وہ اخوان رسول قرار پائیں گے۔

مزید مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب رسول نے جو کام انجام دیا، وہ قرآن کے الفاظ میں، اظہارِ دین (48 :29) کا کام تھا۔ بعد کے زمانے میں اخوانِ رسول جو کام انجام دیں گے، وہ حدیث کے الفاظ میں، ادخالِ کلمۂ اسلام کا کام ہوگا۔ ادخالِ کلمہ کا لفظ اپنے آپ یہ متعین کررہا ہے کہ اس کا زمانہ کیا ہوگا۔ دنیا کے تمام چھوٹے اور بڑے گھروں میں ادخالِ کلمہ کا کام صرف اُس وقت انجام دیا جاسکتا ہے جب کہ اُس کے لیے اُس کے موافق اسباب پیدا ہو چکے ہوں۔ مثلاً عالمی کمیونکیشن، مذہبی آزادی، وغیرہ۔ موجودہ زمانے میں یہ تمام اسباب پیدا ہو چکے ہیں، اِس لیے یقینی ہے کہ وہ زمانہ اب وقوع میں آچکا ہے جب کہ اخوانِ رسول کی جماعت ظاہر ہو اور وہ نئے مواقع کو استعمال کرکے عالمی ادخالِ کلمہ کا کام انجام دے۔

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سارا کام بشر کی سطح پر ہوگا، نہ کہ فوق البشر کی سطح پر۔ اصحاب رسول بشر تھے۔ انھوں نے بشر کی سطح پر اپنے رول کو انجام دیا۔ اصحاب رسول کو اُن کے معاصرین میں سے صرف اُن لوگوں نے پہچانا جو یہ جانتے تھے کہ اصحاب رسول بشر ہیں، نہ کہ فوق البشر۔ اِسی طرح بعد کے زمانے میں اخوانِ رسول کا رول بھی بشر کی سطح پر ہوگا۔ اِس بنا پر اخوانِ رسول کو پہچاننے اور ان کا ساتھ دینے کی توفیق صرف وہ لوگ پائیں گے جو اُن کو بشر کی سطح پر پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جو لوگ اخوانِ رسول کے بارے میں کوئی پراسرار تصور رکھتے ہوں، جو اُن کو بشر کے بجائے فوق البشر کی سطح پر دیکھنا چاہتے ہوں، وہ اخوانِ رسول کے زمانے میں اخوانِ رسول کو پہچاننے میں اُسی طرح ناکام رہیں گے

جس طرح اصحاب رسول کے زمانے میں لوگ اصحاب رسول کو پہچاننے میں ناکام رہے۔

تائید بذریعہ سیکولر تہذیب

ایک حدیث رسول اِن الفاظ میں آئی ہے: **إن اللہ لیؤیّد ھذا الدین بالرجل الفاجر** (**صحیح البخاری، رقم الحدیث**: 3062) یعنی اللہ ضرور اِس دین کی تائید کرے گا فاجر انسان کے ذریعے۔ اِس حدیث میں فاجر کا لفظ گناہ گار کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ سیکولر یا غیر مومن (unbeliever) کے معنی میں ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ بار بار ایسا ہوا کہ ایک غیر مومن یا غیر متقی انسان نے کسی موقع پر دینِ خداوندی کی مدد کی۔ مثلاً ہجرت کے مشکل سفر میں عبداللہ بن ارقط کی رہنمائی، خیبر کے غزوہ میں قُزمان الظُفری کا صحابہ کے ساتھ لڑنا، وغیرہ۔

اِس قسم کی تائیدِ دین کا غالباً سب سے بڑا واقعہ وہ ہے جو بیسویں صدی عیسوی میں پیش آیا۔ جدید دور میں مغرب کے مفکرین اور سائنس دانوں نے غیر معمولی محنت کر کے فطرت میں چھپے ہوئے رازوں کو دریافت کیا۔ اِس کے نتیجے میں جدید مغربی تہذیب وجود میں آئی۔ یہ تہذیب ایک سیکولر تہذیب تھی اور اس کو وجود میں لانے والے افراد بھی سب کے سب سیکولر تھے۔ نیز اس کا استعمال بھی عام طور پر سیکولر مقاصد کے لیے کیا گیا، لیکن اِس جدید تہذیب کے اندر ایک اور عظیم امکان چھپا ہوا تھا۔ یہ دعوتی امکان تھا۔ اِن دعوتی مواقع نے تاریخ میں پہلی بار اِس بات کو ممکن بنایا کہ زمین پر بسنے والے تمام انسانوں تک خدا کا پیغام موثر انداز میں پہنچا دیا جائے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس کو حدیث میں ادخالِ کلمہ کہا گیا ہے۔

عالمی سطح پر ادخالِ کلمہ کا دعوتی کام پراسرار طور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کام قدیم روایتی وسائل کے ذریعے بھی انجام دینا ممکن نہ تھا۔ مثلاً عُقبہ بن نافع تابعی (وفات: 683ء) گھوڑے پر سوار ہو کر افریقہ کی شمالی سرحد تک گئے، لیکن اُس زمانے میں بحرِ اٹلانٹک کو (Atlantic Ocean) کو پار کرنے کا کوئی وسیلہ موجود نہ تھا، اِس لیے اُن کا دعوتی مشن افریقہ کے ساحل سے آگے نہ بڑھ سکا۔

مغربی تہذیب کے ذریعے دعوت کے جو نئے مواقع کھلے، وہ بنیادی طور پر دو قسم کے مواقع تھے۔

اس کا ایک پہلو وہ تھا جس کو فکری پہلو کہا جا سکتا ہے، یعنی فکری اور نظریاتی اعتبار سے نئے دعوتی مواقع کا پیدا ہونا۔ مثلاً مکمل مذہبی آزادی، عمومی سطح پر روحِ تجسس (spirit of enquiry) کا وجود میں آنا، مذاہب کا غیر اعتقادی مطالعہ، وغیرہ۔ اِس سلسلے میں سب سے بڑا واقعہ یہ ہوا کہ سائنسی مطالعے کے نتیجے میں فطرت (nature) میں چھپے ہوئے قوانین دریافت ہوئے۔ یہ دریافتیں گویا کہ آلاء اللہ (wonders of God) کی دریافتیں تھیں۔ اِن دریافتوں کے نتیجے میں مذہبِ توحید کو خود انسان کے قائم کردہ علمی معیار پر مدلل کرنا ممکن ہو گیا۔ مستقبل میں پیش آنے والا یہی عظیم دعوتی امکان ہے جس کو قرآن کی سورہ حم السجدہ میں بطور پیشین گوئی اِس طرح بیان کیا گیا تھا: **سنريهم آياتنا في الآفاق وفي أنفسهم حتى يتبين لهم أنه الحق** (41:53)۔

اِس سلسلے میں پہلا اہم واقعہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں باقاعدہ طور پر پرنٹنگ پریس کا وجود میں آنا تھا۔ اِس ٹکنالوجی نے دعوت کے کام کو دستی کتابت کے مرحلے سے نکال کر پرنٹنگ کے مرحلے میں پہنچا دیا۔ اِسی طرح جدید کمیونکیشن کی دریافت ہے۔ جدید کمیونکیشن اور ملٹی میڈیا نے بیسویں صدی عیسوی میں پہلی بار حقیقی طور پر اِس بات کو ممکن بنا دیا کہ خدائی پیغام کو نہ صرف سارے عالم میں پہنچایا جا سکے، بلکہ اس کو اتنی سُرعت کے ساتھ انجام دیا جائے کہ وقت کا معاملہ اضافی (relative) ہو جائے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو موجودہ زمانے میں فوری مواصلات (instant communication) کہا جاتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمیونکیشن اور میڈیا کے میدان میں یہ ناقابلِ قیاس ترقی اِسی لیے ہوئی کہ آخری دور کے داعیوں کی جماعت (اخوانِ رسول) اُس کو استعمال کر کے ادخالِ کلمہ کے عمل کو موثر طور پر انجام دے سکے۔

اصحابِ رسول اور اخوانِ رسول کا مشترک رول

اصحابِ رسول اور اخوانِ رسول ایک ہی امت کے دو مختلف گروہ ہیں۔ دونوں گروہوں کے درمیان بظاہر ایک ہزار سال سے زیادہ کا فاصلہ ہوگا۔ دونوں اپنے اپنے دور کے اعتبار سے دعوت الی اللہ کا کام انجام دیں گے، مگر دونوں گروہوں کے درمیان ایک چیز مشترک (common) ہوگی، وہ

یہ کہ دونوں اللہ کی خصوصی توفیق سے ایک ایسے منفی اتحاد (nexus) کو توڑیں گے جو دعوتی مشن کے راستے میں سنگین رکاوٹ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

اصحابِ رسول کا زمانہ ساتویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ اُس زمانے میں یہ صورتِ حال تھی کہ ہزاروں سال کی روایات کے نتیجے میں شرک اور پولٹکل پاور کے درمیان خطرناک قسم کا اتحاد (nexus) قائم ہوگیا تھا۔ یہ اتحاد، دعوت الی اللہ کے کام کو آگے بڑھانے میں ایک مستقل رکاوٹ (road block) بنا ہوا تھا۔ شرک کے علم بردار پولٹکل پاور کی مدد سے توحید کی دعوت کو ابتدا ہی میں کچل کر ختم کر دیتے تھے۔ اصحابِ رسول نے شرک اور پولٹکل پاور کے اِس منفی اتحاد کو اپنی بے پناہ قربانیوں کے ذریعے ختم کیا۔

ساسانی ایمپائر اور رومی ایمپائر کے خلاف مسلح ٹکراؤ اِسی قسم کا آخری اور فیصلہ کن واقعہ تھا۔ اِس ٹکراؤ کا آغاز دونوں ایمپائر کی طرف سے کیا گیا۔ اُس وقت اصحابِ رسول نے خلیفہ عمر فاروق کی قیادت میں بے مثال قربانی کا ثبوت دیا، یہاں تک کہ دونوں ایمپائر ٹوٹ گئے۔ اِس کے بعد یہ ہوا کہ توحید کا رکا ہوا سیلاب ایک طوفان بن کر سارے عالم میں پھیل گیا۔

اِسی طرح بیسویں صدی میں ایک نیا غیر مطلوب اتحاد (nexus) قائم ہوا ہے۔ اِس اتحاد کو الحاد (atheism) اور سائنس کے درمیان اتحاد کہہ سکتے ہیں۔ سائنس اپنی حقیقت کے اعتبار سے، علمِ فطرت کا نام ہے، لیکن الحاد کے علم برداروں نے سائنس کو غلط تعبیر کے ذریعے الحادی نظریات کی حمایت کے لیے استعمال کیا، انھوں نے سائنس کو اپنے مقصد کے لیے ہائی جیک (highjack) کرلیا۔ یہ گویا سیکولرائزیشن آف سائنس (secularization of science) کا معاملہ تھا۔ اِس طرح عملاً یہ ہوا کہ جدید سائنس دعوتِ توحید کی معاون بننے کے بجائے اس کی رقیب (rival) بن گئی۔ بدقسمتی سے لوگوں نے ہائی جیکڈ سائنس (highjacked science) کو جانا، وہ پیور سائنس (pure science) سے بے خبر رہے۔ اس لیے وہ سائنس کے بارے میں منفی ہوگئے، انھوں نے سائنس اور الحاد کو ہم معنی سمجھ لیا۔

بعد کے زمانے کے اخوانِ رسول دوبارہ یہ کارنامہ انجام دیں گے کہ وہ سائنس اور الحاد کے اِس اتحاد کو توڑیں اور دوبارہ توحید کو ایک فکری اور نظریاتی سیلاب کا درجہ عطا کردیں۔ اصحاب رسول کو اِس مقصد کے لیے مسلح جہاد کرنا پڑا تھا۔ اخوانِ رسول کے زمانے میں حالات بدل چکے ہوں گے۔ اخوانِ رسول اپنا مقصد فکری جہاد (ideological jihad) کے ذریعے حاصل کریں گے۔

اخوانِ رسول کا رول

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دعوتی مشن کا آغاز 610 عیسوی میں مکہ میں کیا۔ آپ خدا کے آخری رسول تھے۔ آپ کے زمانے میں پہلی بار آپ کے متبعین (followers) کی ایک طاقت ور ٹیم بنی۔ اِس ٹیم کو تاریخ میں، اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔ پیغمبر اسلام کی ایک پیشین گوئی کے مطابق، آخری زمانے میں دوبارہ آپ کے متبعین کی ایک طاقت ور ٹیم بنے گی۔ اِس دوسری ٹیم کو حدیث میں اخوانِ رسول کہا گیا ہے۔ یہ دوسری ٹیم خدا کی خصوصی مدد سے آخری زمانے میں اہم دعوتی رول ادا کرے گی۔

اِن دونوں جماعتوں کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ قرآن کی سورہ الفتح کی آخری آیتوں کے مطالعے سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ اِن آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: ''محمد، اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں، وہ منکروں کے اوپر شدید ہیں۔ وہ باہم ایک دوسرے کے لیے مہربان ہیں۔ تم ان کو رکوع میں، سجدہ میں دیکھو گے، وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کی طلب میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی نشانی اُن کے چہروں پر ہے، سجدہ کے اثر سے۔ ان کی یہ مثال تورات میں ہے۔ اور انجیل میں ان کی مثال یہ ہے کہ جیسے کھیتی، اس نے اپنا انکھوا نکالا، پھر اس کو مضبوط کیا، پھر وہ اور موٹا ہوا، پھر وہ اپنے تنے پر کھڑا ہوگیا۔ وہ زارعین کو بھلا معلوم ہوتا ہے، تاکہ وہ ان سے منکروں کو جلائے۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا، اللہ نے ان سے معافی کا اور ایک بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے''۔ (48: 29)۔

قرآن کے اِس حصے میں دو حوالوں کا ذکر ہے، تورات اور انجیل۔ تورات کے حوالے سے اصحاب رسول کا وہ انفرادی کردار بیان ہوا ہے جس کا اظہار دورِ اول میں خود زمانہ رسالت میں پیش آیا۔ انھوں نے

خالص جوہر (merit) کی بنیاد پر پیغمبر اسلام کو پہچانا اور کسی تحفظ (reservation) کے بغیر آپ کا ساتھ دیا۔ وہ اعلیٰ درجے کے بااصول افراد تھے۔ وہ کامل معنوں میں عبادت گزار تھے۔ وہ اللہ پر اعتماد کرنے والے تھے۔ موجودہ تورات میں ان کے لیے قدسیوں (saints) کا لفظ آیا ہے (Deuteronomy 33:2)۔

انجیل میں حضرت مسیح کی زبان سے اصحابِ رسول کا جو ذکر آیا ہے، وہ درخت کی تمثیل کے روپ میں ہے (Mathew 13:31-32)۔ درخت کی تمثیل سے مراد تاریخی عمل (historical process) ہے۔ اصحابِ رسول کا ایک رول وہ ہے جو انھوں نے اپنے زمانے میں ادا کیا۔ ان کا دوسرا رول وہ تھا جو پراسس کے روپ میں انجام پایا۔ اصحابِ رسول کے انقلابی عمل نے تاریخ میں ایک پراسس جاری کیا جو مختلف صورتوں میں بعد کی نسلوں میں آگے بڑھتا رہا۔

چار ہزار سال پہلے ہاجرہ اور اسماعیل کے ذریعے عرب کے صحرا میں ایک پراسس جاری ہوا تھا۔ اِس پراسس کے نقطۂ انتہا (culmination) کے طور پر ساتویں صدی عیسوی میں اصحابِ رسول (companions of the Prophet) کا گروہ وجود میں آیا۔ اس کے بعد دوسرا تاریخی پراسس وہ تھا جو ساتویں صدی عیسوی میں اصحابِ رسول کے انقلابی عمل کے ذریعے تاریخ میں شروع ہوا۔ اِس دوسرے تاریخی پراسس کا نقطۂ انتہا (culmination) وہ لوگ ہوں گے جن کو حدیث میں اخوانِ رسول (brothers of the Prophet) کہا گیا ہے۔

احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اخوانِ رسول کا یہ گروہ غالباً اُس زمانے میں پیدا ہونے والا تھا جس کو عام طور پر سائنسی دور کہا جاتا ہے۔ اخوانِ رسول کا گروہ سائنسی زمانے کی دریافتوں سے واقف ہو کر اعلیٰ معرفتِ رب حاصل کرے گا۔ دوسری طرف وہ نئے طاقت ور ذرائع کو استعمال کر کے اُس عالمی دعوت کو انجام دے گا جس کو حدیث میں **ادخالُ الكلمة في كلِّ البيوت** (ہر گھر میں کلمۂ اسلام کا داخلہ) کہا گیا ہے۔

بعد کے دور کے اہلِ ایمان

روایات میں بعد کے دور کے ایسے اہلِ ایمان کا ذکر ہے جو ایمان و اسلام کے خصوصی اوصاف

کے حامل ہوں گے۔ اِس سلسلے میں چند روایتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں:

حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **مثل أمتی مثل المطر، لا یدری أولہ خیر أم آخرہ** (الترمذی، رقم الحدیث: 2869) یعنی میری امت کی مثال بارش کی مثال جیسی ہے۔ نہیں معلوم کہ اس کا پہلا زمانہ بہتر ہوگا یا اس کا آخری زمانہ۔

اِس حدیث میں بارش کی مثال کے ذریعے ایک تاریخی پراسس (historical process) کو بتایا گیا ہے۔ رسول اور اصحاب رسول کے ذریعے ساتویں صدی عیسوی میں جو انقلاب آیا، وہ اپنے آغاز کے اعتبار سے، ایک زمانی ظاہرہ تھا۔ اُس کے ذریعے جو تاریخی پراسس جاری ہوا، وہ اپنے مابعد انجام کے اعتبار سے مستقبل کا ایک واقعہ ہے۔ اِس مستقبل سے مراد غالباً وہی تاریخی ظاہرہ ہے جس کا حوالہ دوسری روایت میں اخوان رسول کے الفاظ میں ملتا ہے۔

حضرت مالک الاشعری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **عباد لیسوا بأنبیاء ولا شہداءَ، یغبطھم النبیون والشھداء لمقعدھم وقربھم من اللہ یوم القیامۃ** (مسند احمد، جلد 5، صفحہ 341) یعنی خدا کے کچھ بندے ایسے ہیں جو نہ تو پیغمبر ہیں اور نہ شہید ہیں، ان کے اوپر پیغمبر اور شہید بھی رشک کریں گے، اُن کے اُس درجے اور قربت کی وجہ سے جو قیامت کے دن انھیں خدا کے یہاں حاصل ہوگا۔

اِس روایت میں غالباً اُن اہلِ ایمان کا ذکر ہے جو دورِ سائنس میں پیدا ہوں گے، جب کہ فطرت میں نئی دریافتوں کی بنا پر معرفت کا نیا فریم ورک وجود میں آئے گا اور اس کو استعمال کر کے کسی کے لیے یہ ممکن ہو جائے گا کہ وہ اعلیٰ معرفت کا تجربہ کرے۔ غالباً اِس جماعت سے مراد وہی لوگ ہیں جن کو دوسری روایت میں اخوانِ رسول کہا گیا ہے۔

اصحابِ رسول اور اخوانِ رسول دونوں کا معاملہ ایک اعتبار سے یکساں ہے۔ وہ ہے اپنے زمانے کے مواقع کا دینی استعمال۔ اصحاب رسول نے بنو اسماعیل کے ذریعے پیدا ہونے والی صحرائی تہذیب کے مواقع کو استعمال کیا۔ اخوانِ رسول بعد کے زمانے میں سائنسی دور کے مواقع کو دین کے

لیے استعمال کریں گے۔ ان مواقع کو اخوانِ رسول کے ذریعے استعمال کئے جانے کی جو صورتیں مطالعہ کے ذریعے سمجھ میں آتی ہیں، وہ غالباً یہ ہوں گی:

1- فطرت میں سائنسی دریافتوں کے ذریعے پیدا ہونے والے استدلالی مواقع کا استعمال۔ مثلاً خدا کے وجود پر فلاسفہ اور متکلمین کے مبنی بر معنویت استدلال (argument from design) کو جدید شواہد کے ذریعے مدلل کرنا۔

2- جدید مواصلاتی مواقع کا عالمی دعوت کے لیے استعمال، یعنی پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا اور دوسرے ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے دعوت کی عالمی اشاعت۔

3- بعد کے دور میں حاصل ہونے والی مذہبی آزادی کا بھرپور استعمال، دعوتِ حق کی عمومی اشاعت کے لیے پرامن جدوجہد۔

عالمی انذار وتبشیر

قرآن کی سورہ الفرقان میں یہ آیت آئی ہے: **تبارك الذی نزّل الفرقان علی عبده لیکون للعالمین نذیرا** (25: 1)۔ یعنی بہت بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر قرآن اتارا، تاکہ وہ سارے عالم کے لیے آگاہ کرنے والا ہو۔ اِس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن کو عالمی انذار وتبشیر کے لیے اتارا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ قرآن ساتویں صدی عیسوی کے رُبع اول میں اترا۔ اُس وقت اور اس کے بعد ہزار سال تک وہ ذرائع موجود نہ تھے جن کو استعمال کرکے قرآن کرہ ارض کے تمام انسانوں تک پہنچادیا جائے، نہ قرآن کے چھپے ہوئے نسخے موجود تھے، نہ تیز رفتار سواریاں تھیں، نہ جدید کمیونکیشن تھا۔ اُس زمانے میں ساری دنیا میں صرف علاقائی زبانیں (regional languages) تھیں۔ کوئی ایسی بین الاقوامی زبان (international language) موجود نہ تھی جس میں ترجمہ کیا جائے تو قرآن تمام لوگوں کے لیے قابل فہم بن سکے، وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیوں کر یہ ممکن تھا کہ قرآن کا مقصدِ نزول پورا ہو اور پہنچانے والے اس کو تمام انسانوں تک پہنچادیں۔

اس کا جواب قرآن کی ایک اور آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کی سورہ الانعام میں یہ آیت آئی ہے: وأوحي إليَّ هذا القرآن لأنذركم به ومَن بلغ (6:19) یعنی اے رسول کہہ دو کہ مجھ پر یہ قرآن اترا ہے، تاکہ میں تم کو اُس سے خبردار کردوں، اور وہ بھی جسے یہ قرآن پہنچے، یعنی میں اپنے زمانے کے لوگوں کو آگاہ کروں، اور میرے بعد آنے والے اہلِ ایمان اپنے زمانے کے لوگوں کو اس سے آگاہ کرتے رہیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اپنے ہم زمانہ (contemporaries) لوگوں تک قرآن کو پہنچا دے۔ اس کے بعد امت کی یہ مستقل ذمہ داری ہے کہ وہ ہر دور کے لوگوں تک قرآن کو پہنچاتی رہے۔ امت کی ہر نسل کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے زمانے کے لوگوں تک اُسی طرح قرآن کو پہنچائے جس طرح پیغمبر نے اپنے زمانے کے لوگوں تک قرآن کو پہنچایا تھا۔

قرآن کی دعوتی اشاعت کا یہ کام نسل در نسل کیا جانے والا کام ہے۔ اِس ابتدائی دور میں قرآن کی دعوتی اشاعت کا کام جن لوگوں نے انجام دیا، اُن کو صحابی اور تابعین اور مفسرین، وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اِسی طرح دورِ آخر میں بھی امت کا ایک خصوصی گروہ ہوگا جو اپنے زمانے کے نئے پیدا شدہ مواقعِ دعوت کو استعمال کر کے قرآن کی عمومی اشاعت کا یہ کام انجام دے گا۔ آخری دور کا یہی وہ خصوصی گروہ ہے جس کو حدیث میں اخوانِ رسول کا نام دیا گیا ہے۔

سیکولر سویلائزیشن، اسپرچول سویلائزیشن

قرآن کی سورہ الذاریات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وما خلقتُ الجنّ والإنس إلا ليعبدون (51:56)۔ اِس آیت میں 'یعبدون' سے مراد 'یعرفون' ہے، یعنی اللہ نے جن اور انس کو صرف اِس لیے پیدا کیا ہے تاکہ وہ اللہ کی معرفت حاصل کریں۔ اللہ کی معرفت حاصل کرنے کا ذریعہ غور وفکر (contemplation) ہے، یعنی تخلیقات میں غور کر کے خالق کی معرفت حاصل کرنا اور پھر اس کے مطابق، اپنی زندگی کی تعمیر کرنا۔

مقصدِ تخلیق کے بارے میں ایک مشہور قول یہ ہے: كنتُ كنزاً مخفياً، فأحببتُ أن أعرف، فخلقتُ الخَلْقَ (كشف الخفاء، 2/1011) یعنی اللہ نے فرمایا کہ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، پھر

میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں، تو میں نے اِس مقصد کے لیے خلق (انسان) کو پیدا کیا۔ کسی عارف کا یہ قول اصلاً سورہ الذاریات کی مذکورہ آیت کی تفسیر ہے۔ قائل نے کلام کی رعایت سے اس کو حدیث قدسی کے اسلوب میں بیان کر دیا ہے۔ اگر اسلوب کو بدل دیا جائے اور اس کو معروف تفسیری اسلوب میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہوگا: **كان الله كنزاً مخفياً، فأحبّ أن يُعرف، فخلق الخَلْق**۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے جنات کو پیدا کیا۔ ان سے یہ مطلوب تھا کہ وہ کائنات میں چھپے ہوئے رموزِ معرفت کو دریافت کریں اور خدا کی عظمت کا اعلان واظہار کریں۔ مگر جنات کے سردار ابلیس کے قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات **أنا خير منه** (7:12) کی نفسیات میں مبتلا ہو گئے، وہ اللہ کی کبریائی کی معرفت حاصل نہ کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جنات نے خود اپنی عظمت (self-glory) کو جانا، مگر وہ خدا کی عظمت (glory of God) کو دریافت کرنے میں ناکام رہے۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ انسان کی تخلیق اِس لیے ہوئی کہ وہ جنات کے بعد اُن کا جانشین بنے۔ اُس وقت یہ معاملہ فرشتوں کی سمجھ میں نہیں آیا۔ انھوں نے یہ اشکال ظاہر کیا کہ جس طرح جن، مقصد تخلیق کو پورا کرنے میں ناکام رہے، اُسی طرح انسان بھی ناکام رہے گا، وہ تخلیق کے مقصد کو پورا نہ کر سکے گا۔

فرشتوں کے اشکال کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک مظاہرہ (demonstration) کا انتظام کیا۔ اِس مظاہرے کا خلاصہ قرآن کے اِن الفاظ میں ملتا ہے: **علّم آدم الأسماء كلّها** (2:31)۔ اِس آیت میں اسماء سے مراد مسمّیات ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے اضافی انعام کے طور پر انسان کو تمام اشیا کا علم عطا فرمایا، اُس نے انسان کی فطرت میں تمام تخلیقات کا علم داخل کر دیا۔ اِس طرح انسان اپنے لاشعور (unconscious mind) کی سطح پر بطور امکان (potentially) ہر چیز سے واقف ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے وقتی طور پر اِس کا مظاہرہ بھی کیا۔ اس کے بعد فرشتے مطمئن ہو گئے۔

قرآن کے اِس حصے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات کو دماغ دیا گیا تھا، لیکن اجزاءِ معرفت کا پیشگی علم اُنھیں حاصل نہ تھا۔ اُن سے مطلوب تھا کہ وہ اپنے دماغ کو استعمال کر کے کائنات میں چھپے ہوئے رموزِ معرفت کو دریافت کریں۔ انھیں غور وفکر کے ذریعے اپنے نامعلوم کو معلوم

بنانا تھا، مگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے۔

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مزید اہتمام کے ساتھ انسان کو پیدا فرمایا۔ وہ مزید اہتمام یہ تھا کہ جن اجزاءِ معرفت کو اُسے دریافت کرنا تھا، اس کو پیشگی طور پر اس کے لاشعور میں داخل کر دیا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن کی اِس آیت میں بیان کیا گیا ہے: **بل هو آيات بينات في صدور الذين أوتوا العلم** (29:49) یعنی تمام اجزاءِ معرفت پیشگی طور پر انسان کے لاشعور (unconscious mind) میں موجود ہیں۔ اب انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے اِس لاشعور کو شعور میں لے آئے۔

دریافت یا ان فولڈنگ

مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کو علمی دنیا میں دریافت (discovery) کہا جاتا ہے، وہ حقیقت میں دریافت نہیں ہے، بلکہ وہ ان فولڈنگ (unfolding) ہے، یعنی جو چیزیں انسان کی فطرت میں پہلے سے بالقوہ (potential) طور پر موجود ہیں، اُن کو بالفعل (actual) طور پر وقوع میں لانا۔ جنات کو اپنے لامعلوم کو معلوم بنانا تھا، اِس میں وہ ناکام ہو گئے۔ اِس لیے اللہ تعالیٰ نے اگلی مخلوق کے لیے تیسیر کا معاملہ فرمایا، یعنی غیر شعوری سطح پر موجود چیزوں کو شعور کی سطح پر معلوم بنانا۔

سائنس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سائنس دانوں کی ہر دریافت اتفاقی دریافت ہے، وہ صرف اتفاقی طور پر سائنس داں کے علم میں آتی ہے:

It is discovered by scientist by the way of accident.

مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ سائنسی دریافتوں کا معاملہ ایکسیڈنٹ (accident) کا معاملہ نہیں، بلکہ وہ کوانسیڈینس (co-incidence) کا معاملہ ہے، یعنی سائنس داں کوئی تجربہ کر رہا ہوتا ہے، اُس وقت ایک چیز فلیش (flash) کرتی ہے۔ یہ فلیش اس کے لاشعور میں موجود ایک علم سے مطابقت کرتا ہے۔ اس کے بعد سائنس داں مزید تجربہ کر کے ایک نئی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے، جس کو دریافت کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک سائنس داں ایک بار ایک برتن کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اِس برتن کے اوپر ایک ڈھکن تھا اور برتن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ برتن کے نیچے آگ جل رہی تھی۔ پانی کا درجۂ حرارت جب

100 ڈگری تک پہنچ گیا تو اس کے اندر پیدا ہونے والی بھاپ سے ڈھکن اوپر اٹھ گیا۔ سائنس داں اس پر غور کرنے لگا، یہاں تک کہ اس نے دریافت کیا کہ پانی کا درجہ حرارت جب بڑھتا ہے تو اس کے مالکیول (molecule) ٹوٹ کر اِدھر اُدھر اڑنے لگتے ہیں۔ مالکیول کے اِس انتشار (moleculor disintegration) سے اسٹیم پاور پیدا ہوتا ہے۔ اِس پاور کے ذریعے انجن چلائے جاسکتے ہیں— پانی کی یہ خاصیت پہلے سے اس کے لاشعور میں موجود تھی۔ مذکورہ مشاہدہ اس کے لاشعور سے مطابقت کر گیا۔ مطابقت کے نتیجے میں انسان نے وہ چیز دریافت کی جس کو اسٹیم پاور (steam power) کہا جاتا ہے۔ اِس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ— دریافتیں کو انسیڈینس کا نتیجہ ہوتی ہیں:

Discoveries are results of co-incidence.

حصولِ معرفت کا ذریعہ

یہی معاملہ معرفت کا ہے۔ معرفت کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے وجود پر سوچتا ہے، وہ کائنات کے مظاہر میں غور وفکر کرتا ہے۔ اِس طرح غور وفکر کے ذریعے وہ رموزِ معرفت کو دریافت کرتا ہے۔ اِن رموزِ معرفت میں پچاس فی صد حصہ خارجی مظاہر کا ہے، اور پچاس فی صد حصہ داخلی اعتبار سے علمِ اشیا کا۔ یہی وہ علمِ اشیا ہے جس کو وجدان (intuition) کہا جاتا ہے۔ تدبر اور تفکر کے ذریعے یہ ہوتا ہے کہ آدمی دونوں کے درمیان مطابقت کو دریافت کرتا ہے۔ یہ واقعہ مسلسل پیش آتا ہے اور اِس طرح مومن کا سفرِ معرفت مسلسل طور پر جاری رہتا ہے۔

معرفت کا حصول کوئی پراسرار چیز نہیں، وہ تخلیق میں تدبر کر کے خالق کو دریافت کرنے کا نام ہے۔ یہ عمل اسلام کے ظہور کے بعد مسلمانوں میں ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہو گیا تھا۔ قرآن کے ذریعے ان کے اندر تحریک ہوئی اور وہ کائنات کی چیزوں میں معرفت کے نقطۂ نظر سے غور وفکر کرنے لگے۔ مثال کے طور پر ایک صحابی رسول ابوذر غفاری کہتے ہیں کہ: **ولقد ترکنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، وما یقلّب طائر جناحیہ فی السماء، إلّا ذکر لنا منہ علماً** (تفسیر ابن کثیر، جلد 2، صفحہ 131) یعنی ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس حال میں چھوڑا کہ

ایک چڑیا بھی آسمان میں اپنا پر پھڑ پھڑاتی تھی تو آپ اُس سے ہم کو ایک علم کی یاد دلاتے تھے۔

تخلیق کے نظام میں غور وفکر کرکے معرفت کی خوراک حاصل کرنے کا کام مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر شروع ہوا اور صدیوں تک جاری رہا۔ علم کلام میں جس چیز کو مبنی بر براہین استدلال کہا جاتا ہے، وہ یہی ہے۔ مگر مسلمان علمِ معرفت یا سائنس آف معرفت کو ایک حد سے آگے نہ بڑھا سکے۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ قدیم زمانے میں غور وفکر کے لیے صرف روایتی فریم ورک (traditional framework) موجود تھا، اور روایتی فریم ورک میں مشاہدہ اور تجربہ کا عمل صرف محدود دائرے میں ممکن ہوتا تھا۔

اِس معاملے میں زیادہ وسیع غور وفکر صرف موجودہ زمانے میں ممکن ہوا، جب کہ دور بین (telescope) اور خوردبین (microscope) جیسے آلات ایجاد ہوئے۔ دوربین کو پہلی بار گلیلیو نے 1609 میں فلکیاتی مشاہدے کے لیے استعمال کیا۔ خوردبین پہلی بار 1590 میں دریافت ہوئی۔ اِن دریافتوں کے بعد عالمِ کبیر (macro world) اور عالمِ صغیر (micro world) دونوں کا مشاہدہ زیادہ گہرائی کے ساتھ ممکن ہوگیا۔ معرفت کے حقائق جو اب تک انسان کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے، وہ اب انسان کے براہِ راست علم میں آنے لگے۔ بعد کے دور میں یہ کام تمام تر اہلِ مغرب نے انجام دیا۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں مغربی علماء کے ذریعے فطرت کی تحقیقات سامنے آئیں، انھوں نے معرفتِ خداوندی کے نئے وسیع تر دروازے کھول دئے۔ اِس کے بعد تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا کہ پہلے جو چیز صرف عقیدہ کا درجہ رکھتی تھی، وہ اب علمی مسلّمہ کے درجے میں ایک ثابت شدہ واقعہ بن گئی (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم الحروف کی کتاب 'مذہب اور جدید چیلنج')۔

مغربی سائنس دانوں نے موجودہ زمانے میں جو کام کیا، وہ علمِ معرفت کے اعتبار سے بہت بڑا کام تھا۔ اِس اعتبار سے، یہ مغربی علماء پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس پیشین گوئی کا مصداق تھے:

إن اللّٰه ليؤيّد هذا الدين بالرجل الفاجر۔

ایک مغالطہ

جدید سائنس کی دریافتیں دراصل آلاء اللہ (wonders of God) کی دریافتیں تھیں۔

وہ خالق کی معرفت کا ایک نیا خزانہ کھولنے کے ہم معنی تھیں۔ لیکن جن مغربی علماء نے اِس میدان میں کام کیا، وہ سب سیکولر ذہن کے لوگ تھے۔ اِس بنا پر عملاً یہ ہوا کہ یہ دریافتیں معرفتِ رب کے بجائے سیکولر نظریے کی حمایت بن کر رہ گئیں۔ حالاں کہ سائنس کا یہ سیکولرائزیشن (secularization) صرف ایک مغالطہ (fallacy) کی حیثیت رکھتا تھا۔

مثلاً ایک مغربی مفکر نے جدید سائنس کی دریافتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ اِن دریافتوں سے معلوم ہوا کہ فطرت (nature) میں ایک قانونِ اسباب (law of causation) قائم ہے، یعنی ہر واقعہ اسباب وعلل کے نظام کے تحت واقع ہوتا ہے۔ اِس کا حوالہ دیتے ہوئے اُس نے لکھا ہے کہ — اگر واقعات فطری اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں تو وہ فوق الفطری اسباب کا نتیجہ نہیں ہو سکتے:

If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes.

مگر یہ صرف ایک مغالطہ ہے، کیوں کہ فطرت کا قانون اپنے آپ میں توجیہہ نہیں ہے، بلکہ وہ خود اپنے وجود کے لیے ایک توجیہہ کا طالب ہے۔ اِس اعتبار سے، صحیح بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ — اگر واقعات قوانین سے کنٹرول ہوتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس کا ایک کنٹرول کرنے والا ہو:

If events are controled by laws, then there must be a controller of laws.

جرمن سائنس داں البرٹ آئن اسٹائن (وفات: 1955) نے فطرت کے نظام کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس کو نظر آیا کہ فطرت کے نظام میں نہایت بامعنی ڈیزائن پایا جاتا ہے۔ اِس طرح وہ گویا کہ معرفت کے دروازے تک پہنچ گیا، لیکن اس نے یہ کہہ دیا کہ — فطرت کے بارے میں سب سے زیادہ ناقابلِ فہم بات یہ ہے کہ وہ قابل فہم ہے:

The most incomprehensible fact about nature is that it is comprehensible.

یہ بلاشبہہ ایک مغالطہ آمیز بیان ہے۔ آئن اسٹائن نے جب فطرت میں غیر معمولی معنویت

دیکھی تو اس کو برعکس طور پر یہ کہنا چاہیے تھا کہ — فطرت میں اتنی زیادہ معنویت پائی جاتی ہے کہ ضروری ہے کہ اس کا ایک ڈزائنر ہو:

Nature is so well-designed that it is inconceivable that there is no designer of it.

جنت کا دور

قرآن کی سورہ الکہف کی آخری چند آیتیں یہ ہیں: **إن الذين امنوا وعملوا الصالحات كانت لهم جنات الفردوس نزلاً۔ خالدين فيها لا يبغون فيها حولاً۔ قل لو كان البحر مداداً لكلمات ربي، لنفد البحر قبل أن تنفد كلمات ربي، ولو جئنا بمثله مدداً** (18: 107-109) یعنی بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا، اُن کے لیے فردوس کے باغوں کی مہمانی ہے۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہ وہاں سے کبھی نکلنا نہ چاہیں گے۔ کہو کہ اگر سمندر میرے رب کے کلمات کو لکھنے کے لیے روشنائی بن جائے، تو سمندر ختم ہو جائے گا، اِس سے پہلے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں، اگر چہ ہم ایسا ہی اور سمندر اس کی مدد کے لیے لے آئیں۔

قرآن کی اِن آیات کے چار حصے ہیں۔ اس کے پہلے حصہ (**إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات**) میں یہ بتایا گیا ہے کہ تخلیقی منصوبہ کے مطابق، خدا کا مطلوب انسان کون ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو خالق کو دریافت کرے۔ یہ دریافت اتنی گہری ہو کہ اس کی پوری زندگی ہر اعتبار سے اس کے مطابق ڈھل جائے، وہ کامل معنوں میں ایک ربانی انسان بن جائے۔ یہی وہ ربانی انسان ہے جو آخرت کی دنیا میں خدا کے سب سے بڑے انعام کا مستحق قرار پائے گا۔

آیت کا دوسرا حصہ یہ ہے: **كانت لهم جنات الفردوس نزلاً**۔ اِس حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ ربانی انسان کو آخرت میں یہ موقع ملے گا کہ وہ جنت کی معیاری دنیا میں ابدی طور پر قیام کر سکے۔ جنت کی دنیا میں یہ قیام مہمانی (hospitality) کے طور پر ہوگا، یعنی جنت میں ان ربانی انسانوں کا قیام سادہ طور پر صرف عیش کے لیے نہ ہوگا، بلکہ وہ مہمانی کے طور پر ہوگا۔ یعنی خدائی منصوبہ کے مطابق، اہلِ جنت مکمل طور پر ایک سرگرم زندگی گزاریں گے۔ یہ زندگی ان کے

لیے پوری طرح تعب اور مشقت سے خالی ہوگی۔ وہ اُن کے لیے شُغلِ فاکہ (35: 55) کے ہم معنی ہوگی، یعنی پُر لطف سرگرمیوں (enjoyable activities) کی زندگی۔

اِس جنتی زندگی کے بارے میں تیسری بات یہ فرمائی کہ: **خالدین فیھا، لا یبغون عنھا حولاً**۔ یعنی اس میں ہمیشہ رہنے کے باوجود اہل جنت کبھی اکتاہٹ (boredom) کا شکار نہ ہوں گے۔ وہ دوامی طور پر انتہائی معنوں میں ایک پر لطف مشغولیت کے ساتھ جنت میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں گے۔ یہ سرگرمیاں کبھی ختم نہ ہوں گی اور نہ کبھی ان کی دل چسپیوں کی حد آئے گی۔ یہ اہلِ جنت کے لیے ایک ایسی مسرت ہوگی جو کامل بھی ہوگی اور ابدی بھی۔

مذکورہ قرآنی بیان کا چوتھا حصہ یہ ہے: **قل لو کان البحر مداداً لکلمات ربي، لنفد البحر قبل أن تنفد کلمات ربي، ولو جئنا بمثله مدداً**۔ قرآن کے یہ الفاظ اہل جنت کی اُس اعلیٰ ترین سرگرمی کو بتاتے ہیں جس میں اہلِ جنت کامل لذت و مسرت کے ساتھ مشغول رہیں گے۔ یہ سرگرمی ہے— کلمات اللہ کی دریافت (discover) کرنا اور اِس طرح اعلیٰ معرفت کے حصول کے لامتناہی سفر میں مشغول رہنا۔

انسان کے لیے سب سے زیادہ محبوب چیز یہ ہے کہ اس کی تمام خواہشیں (desires) پوری ہوں، اس کو پورا فل فل مینٹ (fulfilment) حاصل ہو۔ اِس کو انسان کی زندگی کا مادی تقاضا کہہ سکتے ہیں۔ یہ تمام تقاضے جنت میں انتہائی کامل اور آئڈیل صورت میں پورے ہوں گے۔ قرآن میں اِسی کی طرف اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: **ولکم فیھا ما تشتھي أنفسکم، ولکم فیھا ما تدعون** (41: 31) یعنی تمھارے لیے وہاں ہر وہ چیز ہے جس کو تمھارا دل چاہے، اور تمھارے لیے جنت میں ہر وہ چیز ہے جس کو تم طلب کرو گے۔

اہلِ جنت کا مشن

دوسری اعلیٰ چیز جو ربانی انسان کو جنت میں مشن کی صورت میں حاصل ہوگی، وہ معرفت کی مسلسل دریافت ہے۔ یہ معرفت وہی چیز ہے جس کو قرآن میں مختلف الفاظ میں مثلاً کلمات اللہ (18: 109)،

آلاءِ رب (55: 130) اور آیاتِ رب (41: 53)، وغیرہ جیسے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ جس خالق نے یہ انتہائی بامعنی کائنات بنائی ہے، وہ خود بلاشبہہ ہزاروں بامعنی کائنات سے زیادہ بامعنی ہے۔ اس کی معنویت کا ایک بہت چھوٹا حصہ جدید سائنس نے دریافت کیا ہے۔ مگر سائنس دانوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ ان کی دریافتیں اتنی زیادہ حقیر ہیں کہ وہ کم سے کم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے (knowing more and more about less and less) کے ہم معنی ہیں۔ ایسے لامحدود حد تک بامعنی خالق کی دریافت بیک وقت ایک انتہائی پرمسرت تجربہ ہے اور اسی کے ساتھ وہ ایک لامتناہی عمل بھی۔ یہی وہ پرمسرت مشن ہے جس میں اہلِ جنت ہمیشہ کے لیے پرمسرت طور پر مشغول رہیں گے۔

انسان اصلاً ذہن (mind) کا نام ہے۔ ذہن سوچنے کا کام کرتا ہے۔ ذہن کے اندر سوچنے کی صلاحیت (thinking capacity) لامحدود حد تک پائی جاتی ہے۔ ایک سائنس داں نے کہا کہ پوری کائنات میں جتنے پارٹیکل (particle) ہیں، اتنے پارٹیکل صرف ایک فرد کے ذہن (individual brain) میں ہوتے ہیں۔ انسان کا ذہن لامحدود ہے، اس کے مقابلے میں انسان کی عمر بہت زیادہ محدود ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لیے ذہنی فل فل مینٹ (intellectual fulfilment) حاصل ہونا ممکن نہیں، جب کہ ذہنی فل فل مینٹ ہی انسان کا سب سے بڑا مطلوب ہے۔ انسان کے لیے سب سے بڑی خوشی (pleasure) کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن کو استعمال کرکے سوچے اور نئی نئی دریافتیں کرے۔ دریافت (discovery) انسان کی سب سے بڑی لذت ہے اور یہی لذت انسان کو اِس دنیا میں حاصل نہیں ہوتی۔

خدا کا تخلیقی منصوبہ اِس سوال کا جواب ہے۔ خدا کا تخلیقی منصوبہ بتاتا ہے کہ انسان کی زندگی موت پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ وہ موت کے بعد ابدی طور پر جاری رہتی ہے۔ موت کے بعد کی یہ دنیا نہ صرف ابدی ہے، بلکہ وہ معیاری اور کامل بھی ہے۔ اس اگلی دنیا میں انسان کے لیے یہ موقع ہوگا کہ وہ اپنے ذہن کے پوٹنشل کو ان فولڈ (unfold) کرے، وہ اپنی تخلیقیت (creativity) کو ابدی طور پر جاری رکھے۔ وہ مسلسل طور پر وجد آمیز دریافتوں (thrilling discoveries) کی فضا میں جیتا رہے۔

یہ ابدی موقع انسان کو آخرت کی جنت میں ملے گا۔ جنت سادہ طور پر عیش کا مقام نہیں ہے۔ جنت کا زیادہ بڑا پہلو یہ ہے کہ جنت کی آفاقی وسعتوں میں وہ تمام اسباب انتہائی معیاری صورت میں موجود ہوں گے جو دنیا میں صرف ناقص صورت میں ملے تھے۔ قرآن کے مطابق، دنیا میں انسان کو سب چیزیں دی گئی ہیں، لیکن وہ سب بقدر ضرورت ہیں (وآتاکم من کلّ ما سألتموہ) لیکن آخرت میں یہ تمام چیزیں بقدر خواہش دی جائیں گی (ولکم فیھا ما تشتھی أنفسکم)۔

انسان پیدائشی طور پر معیار پسند (idealist) ہے۔ ہر عورت اور مرد اپنی فطرت کے اعتبار سے کامل پسند (perfectionist) ہوتے ہیں، مگر تجربہ بتاتا ہے کہ کوئی بھی شخص اِس دنیا میں اپنے آئڈیل کو نہیں پاتا۔ ہر انسان ایک ایسی چیز کا متلاشی ہے جو موجودہ دنیا میں اُس کے لیے آخری حد تک ناقابلِ حصول ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ ہر انسان ایک متلاشیٔ جنت حیوان ہے:

Man is a paradise-seeking animal.

یہ جنت انسان کو صرف آخرت میں ملے گی، اُس انسان کو جو موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو جنت میں بسائے جانے کا استحقاق ثابت کرے۔ موجودہ دنیا جنت کا استحقاق ثابت کرنے کے لیے ہے اور آخرت عملی طور پر جنت کو پانے کے لیے۔

الصالحون کا دور

قرآن کی سورہ الانبیاء میں بعد کے زمانے کی ایک پیشین گوئی اِن الفاظ میں آئی ہے: **ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر أن الأرض یرثھا عبادي الصالحون** (21: 105) یعنی زبور میں ہم نصیحت کے بعد لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔ یہ پیشین گوئی موجودہ بائبل میں اِن الفاظ میں ملتی ہے— شریروں کی نسل کاٹ ڈالی جائے گی اور صادق، زمین کے وارث ہوں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ آباد رہیں گے:

But the descendants of the wicked shall be cut off. The righteous shall inherit the land, and dwelll in it forever. (Psalm 37: 28-29)

قرآن کی مذکورہ آیت میں 'الصالحون' سے مراد پوری تاریخِ بشری کے منتخب مومنین

(selected believers) ہیں۔ یہ واقعہ قیامت کے بعد آخرت کی دنیا میں پیش آئے گا۔ قیامت کے بعد تمام پیدا ہونے والے انسان حشر کے میدان میں اکھٹا کئے جائیں گے۔ خداوند ذوالجلال اور اس کے فرشتے ظاہر ہوں گے۔ قبل از قیامت دور میں ہر ایک کے عمل کے ریکارڈ کے مطابق، اس کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا۔ کچھ لوگ رد کئے ہوئے (rejected) قرار پائیں گے، کچھ لوگوں کو ان کے قول وعمل کے بہتر ریکارڈ کی بنا پر منتخب کیا جائے گا۔ یہ منتخب لوگ ابدی جنتوں میں داخل کئے جائیں گے، جو ہر اعتبار سے ایک کامل دنیا (perfect world) ہوگی۔ اِس جنتی دنیا میں ابدی طور پر خوف وحزن کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ یہاں داخل ہونے والی عورتوں اور مردوں کے لیے ہر اعتبار سے، کامل طور پر فل فل مینٹ (fulfillment) کا انتظام ہوگا۔

قیامت کے بعد کا جنتی دور ایک آئڈیل دور ہوگا۔ یہ انسان کی وہ آخری منزل ہوگی جس کے لیے موجودہ دنیا کی تخلیق کی گئی تھی۔ موجودہ دنیا کو بنانا اور یہاں انسان کو آباد کرنا امتحان کے لیے تھا، یعنی عملی زندگی میں امتحان لے کر اُن نادر افراد کا انتخاب کرنا جو اعلیٰ معرفت کی سطح پر جینے والے ہوں، جو مکمل طور پر مثبت شخصیت (positive personality) کے مالک ہوں، جو اختیار کے باوجود مکمل طور پر ربانی ڈسپلن کے پابند ہوں، جو اپنے اعلیٰ اوصاف کی بنا پر اِس قابل ہوں کہ وہ خدا کے پڑوس میں رہ سکیں، جو اپنی تخلیق کے اعتبار سے انسان، مگر اپنے اوصاف کے اعتبار سے فرشتوں کے مانند ہوں، جو پوری کائنات کا خلاصہ ہوں، جس طرح گلاب کا پھول ایک پورے درخت کا خلاصہ ہوتا ہے۔

یہ خوش قسمت لوگ ابدی جنت میں رہیں گے، لیکن جنت محض عیش وآرام کا مقام نہیں ہوگا، بلکہ وہ کامل معنوں میں نفیس سرگرمیوں کا مقام ہوگا۔ جنت میں عیش وآرام کی حیثیت دراصل خدائی میزبان (divine hospitality) کی ہوگی۔ اہلِ جنت کا اصل مشن وہ ہوگا جس کو قرآن میں: **وأشرقت الأرض بنور ربها** (39: 69)، اور **وقيل الحمد لله رب العالمين** (39: 75) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی یہ اہلِ جنت اپنی سرگرمیوں کے ذریعے انوارِ رب کو ظاہر کرنے کا ابدی پراسس شروع کریں گے۔ جنت کی دنیا میں الحمدللہ کلچر اپنی کامل صورت میں ظہور پذیر ہوگا۔ اہلِ جنت کے لیے

یہ عمل ایک پر لطف سرگرمی (enjoyable activity) ہوگی۔ جنت کی یہ دنیا اتنی زیادہ پر مسرت ہوگی کہ اہلِ جنت کبھی وہاں تھکن یا اکتاہٹ کا شکار نہ ہوں گے۔

جنت کی اِس دنیا کو دوسرے لفظوں میں اسپریچول سویلائزیشن یا ربانی سویلائزیشن کہا جاسکتا ہے۔ یہ دور ابتدائی طور پر موجودہ دنیا میں شروع ہوا، لیکن موجودہ دنیا ایک محدود دنیا تھی، اِس لیے ربانی سویلائزیشن کا فروغ اِس دنیا میں صرف محدود طور پر ہوسکا۔ آخرت کی لامحدود دنیا میں اِس ربانی سویلائزیشن کا فروغ اپنی آخری صورت میں ہوگا۔ اہلِ ایمان آلاء اللہ کو جنت کی دنیا میں ابدی طور پر ان فولڈ (unfold) کرتے رہیں گے۔ ہر دن ان کے لیے نئی دریافت کی خوشی کا دن ہوگا۔ یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے گا، وہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

کشمیر میں موجود بے شمار دعوتی مواقع کو استعمال کرنے کے لیے ایک منظّم دعوتی مہم چلائی جارہی ہے۔ جو لوگ اِس پروگرام میں شامل ہونا چاہتے ہیں، وہ حسب ذیل پتے پر رابطہ کریں:

Hamidullah Hamid
Executive Director "KIIPS"
Email: kwc.beerwah@gmail.com,
Mob. 9419488008

مولانا وحید الدین خاں کی عصری اسلوب میں فکر انگیز اسلامی کتابیں اور ماہنامہ الرسالہ حسب ذیل پتہ پر دستیاب ہیں:

A. H. M. Danyal
(President, Centre for Peace)
Mahatwana, Phulwarisharif,
Patna - 801505
Mob. 9308477841, 0612-3255435

Maulana Wahiduddin Khan's Lectures Online

To watch Maulana Wahiduddin Khan's lectures live, click on the links given on the homepage of our website: www.cpsglobal.org
English: Saturdays, 5.30 p.m.
Urdu: Sundays, 10.30 a.m.

To listen to recorded lectures visit
http://cpsglobal.org/content/video-streams

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر
اتحاد ملّت
احیاء اسلام
اسباق تاریخ
اسفار ہند
اسلام: ایک تعارف
اسلام: ایک عظیم جدوجہد
اسلام اور عصر حاضر
اسلام پندرہویں صدی میں
اسلام دور جدید کا خالق
اسلام دین فطرت
اسلام کا تعارف
اسلام کیا ہے
اسلامی تعلیمات
اسلامی دعوت
اسلامی زندگی
اقوال حکمت
الاسلام
الربانیۃ
*امن عالم
امہات المومنین
انسان اپنے آپ کو پہچان
*انسان کی منزل
ایمانی طاقت
آخری سفر
باغ جنت
پیغمبر اسلام
پیغمبر انقلاب
تذکیر القرآن (مکمل)
تاریخ دعوت حق
تاریخ کا سبق
تبلیغی تحریک
تجدید دین
تصویر ملت
تعارف اسلام
تعبیر کی غلطی
تعدد ازواج
تعمیر انسانیت

تعمیر حیات
تعمیر کی طرف
تعمیر ملت
حدیث رسول
حقیقت حج
حقیقت کی تلاش
حل یہاں ہے
حیات طیبہ
خاتونِ اسلام
خدا اور انسان
خلیج ڈائری
دعوت اسلام
دعوت حق
دین انسانیت
دین کامل
دین کی سیاسی تعبیر
دین کیا ہے
*دین وشریعت
دینی تعلیم
ڈائری 84-1983
ڈائری 90-1989
ڈائری 92-1991
*ڈائری 94-1993
رازِ حیات
راہ عمل
راہیں بند نہیں
روشن مستقبل
رہنمائے حیات (کتابچہ)
*رہنمائے حیات
زلزلہ قیامت
سبق آموز واقعات
سچا راستہ
سفرنامہ اسپین وفلسطین
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد دوم)
سوشلزم اور اسلام
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ
*سیرتِ رسول

شتم رسول کا مسئلہ
صراطِ مستقیم
صوم رمضان
طلاق اسلام میں
ظہور اسلام
عظمت اسلام
عظمت صحابہ
عظمت قرآن
عظمتِ مومن
عقلیاتِ اسلام
علما اور دور جدید
*عورت معمارِ انسانیت
فسادات کا مسئلہ
فکر اسلامی
قال اللہ وقال الرسول
قرآن کا مطلوب انسان
قیادت نامہ
کاروانِ ملت
کتاب زندگی
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
مذہب اور جدید چیلنج
مذہب اور سائنس
*مسائل اجتہاد
مضامین اسلام
*مطالعۂ حدیث
*مطالعۂ سیرت (کتابچہ)
*مطالعۂ سیرت
*مطالعۂ قرآن
منزل کی طرف
*مولانا مودودی شخصیت اور تحریک
میوات کا سفر
نار جہنم
نشری تقریریں
ہندستان آزادی کے بعد
ہندستانی مسلمان
*ہند-پاک ڈائری
یکساں سول کوڈ

* نئی کتابیں

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

1- الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن 25 فی صد ہے۔ 100 پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن 33 فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

2- زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

3- کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

Rahnuma-e-Hayat by
Maulana Wahiduddin Khan
ETV Urdu
Tuesday and Wednesday 10.30 pm
Saturday and Sunday 6.00 am

ISLAM FOR KIDS by
Saniyasnain Khan
ETV Urdu
Every Sunday 11.30 am